جلد ٦٦ — اکتوبر ١٩٦٦ء — عدد

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے — قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ٦٦	اکتوبر ١٩٦٦ء	عدد ٢

سالانہ چندہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور	٧٥ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

الاخوان المسلمون کا کرنل ناصر کے ہاتھوں جو حشر ہوا ہے، اور اس ضمن میں عدل و انصاف کا جس طرح خون کیا گیا ہے، اور انسانی جان اور ناموس کی جس انداز سے بے حرمتی ہوئی ہے وہ کوئی ایسی ڈھکی چھپی داستان نہیں جس سے دنیا بے خبر ہو۔ خود مغربی اخبارات میں اس ظلم و ستم کی وقتاً فوقتاً جو خبریں شائع ہوتی رہی ہیں انہیں پڑھ کر سنگدل سے سنگدل انسان بھی لرز جاتا ہے اور وہ اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا اس دنیا میں انسان آباد ہیں یا یہ ہماری نظر کا دھوکا ہے؟ ہمیں یہاں جو انسانی بستیاں نظر آتی ہیں وہ کہیں درندوں اور وحشی جانوروں کے بھٹ تو نہیں ہیں جنہیں ہماری نظر نے غلطی سے انسانی آبادیاں سمجھ رکھا ہے؟

اگر دنیا کا ہر انسان اور دنیا کی ہر قوم ظلم و استبداد کو ایک ہی انداز سے دیکھتی اور اس پر ایک ہی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتی تو شاید انسانیت ذہنی اعتبار سے کبھی اتنی پریشان نہ ہوتی۔ ظلم سے بھی بڑھ کر پریشانی انسانیت کو اُس وقت ہوتی ہے جب وہ تہذیب و تمدن کی دعویدار قوموں کے اقوال و افعال میں شدید تضاد دیکھتی ہے اور جب وہ عدل و انصاف کے علمبرداروں کو حق و انصاف کا خون کرتا ہوا پاتی ہے۔ اگر انسانیت کو اس بات کا پوری طرح یقین ہو جاتا کہ انسان اب انسان نہیں رہا بلکہ خونخوار درندہ بن گیا ہے اور اس بنا پر اُس سے کسی خیر، بھلائی، شرافت اور انصاف کی توقع بیکار ہے تو وہ انسان سے، اُس کے مستقبل سے، اُس کے جذبۂ رحم اور انصاف سے یکسر

مایوس ہو کر بیٹھ جاتی۔ مگر اسے کیا کیجیے کہ مغربی قومیں مشرقی اقوام کو وہ سکون بھی نصیب نہیں ہونے دیتیں جو انسان کو انتہائی مایوسی کے عالم میں ملتا ہے۔ مشرق کی ان بدنصیب اقوام کی حالت اہلِ مغرب نے اُس پیاسے کی سی بنا رکھی ہے جو لق و دق صحرا میں پانی کی تلاش میں نکلتا ہے مگر سرابِ سراب کے اُسے کوئی ایسی چیز ہاتھ نہیں آتی جو اُسے تسکین عطا کر سکے۔ آپ اُس سیاہ بخت انسان کی حالت کا خود اندازہ لگائیں جو پیاس سے نڈھال چلچلاتی دھوپ اور تپتی ہوئی ریت کے اندر میلوں کی مسافت اس اُمید پر طے کرتا ہے کہ اُسے پانی کا ٹھنڈا چشمہ ملیگا، لیکن وہ سفر کی ساری دشواریاں برداشت کرنے کے بعد جب وہاں پہنچتا ہے تو اُسے یہ کرب ناک احساس ہوتا ہے کہ یہ تو محض فریب نظر تھا۔ کیا اس شخص کے حق میں یہ اچھا نہ تھا کہ اسے اس فریب میں مبتلا ہی نہ کیا جاتا اور وہ ایک غلط امید پر جینے کے بجائے سکون کے ساتھ موت کی آغوش میں چلا جاتا؟

انسان کو دو بڑی چیزیں ذہنی سکون اور قلبی اطمینان بخش سکتی ہیں۔ یا تو یہ اطمینان کہ وہ جس سمت بھی خلوص اور تدبّر کے ساتھ قدم اٹھا رہا ہے اُس پر چل کر وہ گوہرِ مقصود پالیگا اور جن افراد اور اداروں پر وہ بھروسا کر رہا ہے وہ اُسے کبھی دھوکا نہ دیں گے۔ یا پھر یہ احساس کہ دنیا سراسر دھوکا ہے، یہاں کسی شخص یا قوم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، عدل و انصاف یہاں کسی چیز کا نام نہیں ہے اور آزادی و حریت محض بے معنی الفاظ ہیں۔ اس دوسری صورت میں کم از کم یہ تو ہوگا کہ آدمی کو کامل مایوسی ہو جائے گی، وہ اپنے عزائم اور ارادوں کے خود مدفن تیار کر کے ان کے گرد بیٹھ جائے گا اور امیدوں کا کوئی دیا جلا کر اپنے سکونِ خاطر کو درہم برہم کرنے کے سامان نہ کرے گا

مغربی اقوام نے مشرقی قوموں، اور خصوصاً مسلمانوں پر جو مختلف مظالم کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جب ان کی طرف سے یکسر مایوس ہونے لگتے ہیں تو یہ آزادی اور حریت کے سراب دکھا کر انہیں پھر اس فریب میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ عدل و انصاف کی متاعِ گراں اُن کے ہاں سے ضرور حاصل ہوگی۔ وہ بے چارے پھر ان کی رکاب تھام کر ان کے ساتھ بھاگنا شروع کر دیتے

ہیں اور ایک طویل سفر کی کلفتیں برداشت کرنے کے بعد جب حقائق ان کے سامنے آتے ہیں تو پھر ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

آپ کو اگر مسلمانوں کی اس حکایتِ تشنہ و سراب کا درد انگیز منظر دیکھنا ہو تو ذرا مغربی پریس کے اس طرزِ عمل کو دیکھیں جو اس نے مسلم ممالک کے معاملہ میں اختیار کر رکھا ہے۔ یہ پریس ایک طرف آزادی، جمہوریت، رواداری، انسانی حقوق کے احترام اور عدل و انصاف کے اصولوں کی حمایت کے بلند بانگ دعوے کرتا ہے۔ دوسری طرف اس کا حال یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان ملک میں کوئی ایسی حکومت قائم ہو جائے جو اسلام کی برائے نام بھی پاسداری کرتی نظر آتی ہو تو اس کی ذرا ذرا سی غلطیوں کو یہ خوب اچھالتا ہے اور یہ شور مچا مچا کر زمین و آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے کہ وہاں آزادیاں کچلی جارہی ہیں اور انصاف کا خون کیا جا رہا ہے اور جمہوریت کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ مگر جب کسی مسلمان ملک میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں اسلام کی بیخ کنی ہوتی نظر آئے اور اسلام کے لیے کام کرنے والوں پر ظلم توڑنے میں عدل و انصاف اور آزادی و جمہوریت کے سارے اصول پامال کر ڈالے جائیں تو یہی پریس اپنے ان تمام دعووں کو قطعی فراموش کر دیتا ہے اور اُلٹا ان لوگوں کی پیٹھ ٹھونکنے میں لگ جاتا ہے جو ان کی یہ منہ مانگی مراد پوری کر رہے ہوں۔ اُس وقت انصاف اور انسانی حقوق کی کوئی مٹی پلید ہوتی ان کو نظر نہیں آتی، بلکہ مسلمان حکمرانوں کے اِن کارناموں پر ان کی باچھیں کھلی پڑتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں اشتراکیت زور پکڑ رہی ہو اور روس کا اثر بڑھ رہا ہو، جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز اس گروہ کو ناگوار نہیں ہے، تو یہ لوگ ایسی حالت میں یہ کچھ بھی بخوشی گوارا کریں گے جبکہ وہاں اسلام کے "خطرے" کا قلع قمع ہو رہا ہو۔ اس کی ایک تازہ ترین مثال ملاحظہ ہو۔

اخوان المسلمین کے ساتھ ناصر نے جو سلوک کیا ہے اس پر ساری دنیائے اسلام چیخ اٹھی ہے۔ جن غیر جمہوری طریقوں سے اس تحریک کو مصر میں کچلا گیا ہے، اور عدالت کا جو مضحکہ خیز

ڈرامہ کھیل کر اخوان کو قتل اور قید کی سزائیں دی گئی ہیں۔ اگر دنیا میں کسی اور جگہ یہ کچھ مسلمانوں کے سوا کسی اور کے ساتھ کیا جاتا تو مغربی پریس کا ردعمل اس پر کچھ اور ہوتا۔ مگر چونکہ معاملہ اسلام کے احیاء کی کوشش کرنے والی ایک جماعت کا تھا اس لیے امریکہ کا مشہور ہفت روزہ ٹائم مصر کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس دینی جماعت کو اس انداز سے پیش کرتا ہے گویا کہ یہ قاتلوں، رہزنوں اور ڈاکوؤں کا کوئی گروہ ہے جس کا کام سوائے قتل و غارت کے اور کوئی نہیں۔ اس لحاظ سے یہ گروہ کسی ہمدردی کا مستحق نہیں اور ناصر صاحب نے دنیا پر یہ عظیم احسان کیا ہے کہ انہوں نے اس ظالم اور سفاک گروہ کو کیفر کردار تک پہنچانے میں کسی تامّل سے کام نہیں لیا۔ ٹائم کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

"گزشتہ ہفتے ناصر کی عدالت نے ۹۴ مجرموں کو سزائیں دیں جو اس کا تختہ الٹنے کے لیے مختلف سازشیں کر رہے تھے۔ ان مجرموں میں ۹۲ آدمی مصر کی طاقتور جماعت اخوان المسلمین کے رکن تھے جو پانچ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے۔ یہ جماعت تنگ نظر اور متعصب مذہبی دیوانوں کا ایک خوفناک گروہ ہے جو شراب نوشی اور سینما بینی اور تعلیم نسواں کو ختم کرنے کے درپے ہے اور قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ بارہ برس پہلے اس کے کچھ رہنماؤں کو ناصر پر قاتلانہ حملے کی پاداش میں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا تھا اور اس کے ہزاروں ارکان جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں اس کے اکثر و بیشتر افراد رہا ہو کر زیادہ خطرناک سازشیں کرنے لگے۔ ایک گروہ نے بم بنانے میں خصوصی مہارت حاصل کی۔ دوسرے نے بجلی گھروں اور برقی اور آبی طاقت کے مراکز کو تباہ کرنے میں امتیاز حاصل کیا۔ تیسرے گروہ نے آتشیں اسلحہ کی دل کھول کر سمگلنگ کی اور اس میں فنی مہارت کے خوب جوہر دکھائے۔ برسوں کی منصوبہ بندی کے بعد ناصر کو انقلابی حکومت کی تیرھویں سالگرہ کے موقع پر قتل کرنے کی ایک نئی سکیم تیار کی گئی۔ ایک گروہ کو کرنل ناصر کی کار اور اس کے جلوس کو اڑا دینے پر متعین کیا گیا

اور اس کی ناکامی کی صورت میں دوسرے گروہ کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ آناً فاناً اس کی گاڑی کو اڑا دے۔ یہ دونوں منصوبے ناکام رہنے کی صورت میں ایک گروہ کو اسے گولیوں سے چھلنی کرنے کی سخت تاکید کی گئی۔ مگر ناصر کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ اس سازش کا بروقت علم ہو گیا اور اس نے الاخوان المسلمون کی وسیع پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع کی۔ گزشتہ ہفتے چار ماہ کی عدالتی کارروائی کے بعد سات ارکان کو پھانسی کی سزا دے دی گئی اور ۸۵ افراد کو ایک سال سے لے کر عمر قید تک کی سزائیں دی گئیں۔" (۲ ستمبر ۱۹۶۶ء)

اسی طرح امریکہ کے دوسرے مشہور مجلہ "نیوز ویک" نے اخوان المسلمین کا ذکر کرتے ہوئے اسے ایک تنگ نظر اور متعصب دیوانوں کی دہشت پسند تنظیم سے تعبیر کیا ہے اور ناصر کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا: "اس نے کمال ہنر مندی، چابکدستی اور ذہانت کے ساتھ اسے ٹھکانے لگایا ہے اور اس طرح بڑی جرأت کے ساتھ رجعت پسند عناصر کا قلع قمع کیا ہے۔" (۵ ستمبر ۱۹۶۶ء)

الاخوان المسلمون پہ ان دونوں امریکی پرچوں کے ان تبصروں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے مصری پولیس کے ان تمام الزامات کو لفظ بلفظ صحیح تسلیم کیا ہے جو اس نے اخوان پر لگائے تھے، اور اس نام نہاد عدالتی کارروائی کو بھی بالکل درست سمجھا ہے جس میں اخوان کو کسی صفائی کا موقع دیے بغیر سزائیں دی گئی ہیں حالانکہ اگر اسی طرح کے الزامات لگا کر اور ایسی ہی عدالتی کارروائی کر کے روس، ہنگری، یا یوگوسلاویہ میں کسی اور گروہ کے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا تو ٹائم اور نیوز ویک کے تبصروں کی شان کچھ اور ہی ہوتی۔

یہ وہ عام رجحان ہے جو مغرب کے پورے پریس میں نظر آتا ہے۔ اس کے ہاں انسانی آزادی، قانون کی برتری، جمہوری اقدار اور انسانی حقوق کے بڑے شاندار تذکرے اور فیچر ملیں گے اور یوں محسوس ہوگا کہ پوری دنیا سے مغرب ان کی محافظ اور پاسبان ہے اور ان پر جب ذرا سی آنچ بھی آئے تو وہ سخت مضطرب ہو کر فوراً ان قوتوں کے خلاف صف آرا ہو جاتی ہے جو انہیں پامال

کرنے کا ناپاک عزم رکھتے ہوں۔ ممکن ہے اپنے دائرے میں وہ انسانی بنیادی حقوق کے متعلق اتنی ہی حساس ہو جتنی وہ اس کی نمائش کرتی ہے۔ لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں اس کی روش انتہائی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے۔

اگر اسلام کو دبانے اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے کوئی سفاک آمر یا استعمار پسند قوم آگے بڑھے اور اپنے اِس مقصد کی تکمیل میں اُن تمام اقدار کو روند ڈالے جن کے یہ بڑے پرستار بنتے ہیں، تو جمہوری اقدار کے اِن علمبرداروں کے ضمیر میں قطعاً کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی بلکہ مغربی پریس اور مغربی ممالک اس کے مظالم پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں اور مظلوموں کے حق میں کوئی کلمۂ خیر تو درکنار، کلمۂ انصاف بھی ان کی زبان سے نہیں نکلتا۔

جب کسی مسلمان ملک میں کوئی دین پسند تحریک احیائے اسلام کا پاک اور مقدس عزم لے کر جدوجہد شروع کرے تو مغربی قوموں کو سخت خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور وہ ہر طرح سے اسے بدنام اور رسوا کرنے اور اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس تحریک کے متعلق مغربی پریس طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلاتا ہے، برسر اقتدار طبقوں کو اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ اسے ختم کرنے میں پوری قوت سے کام لیں اور اس وقت تک چین نہیں لیتا جب تک کہ اس تحریک اور اس کے خادموں کی بربادی کا پوری طرح سامان نہ ہو جائے۔

اور اگر محض حسنِ اتفاق سے کسی جگہ کوئی ایسا فرد یا طبقہ برسر اقتدار آ جائے جو اسلام کا علمبردار نہ سہی، محض اس کے بارے میں اچھے جذبات یا نرم رویہ ہی رکھتا ہو تو مغربی پریس اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتا ہے، اس کی معمولی کوتاہیوں اور لغزشوں کو بڑی شد و مد کے ساتھ اُچھالتا ہے، اُسے ذلیل و خوار کرنے کے لیے اس کے بارے میں طرح طرح کی خبریں گھڑتا ہے اور اُس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک کہ غیر اسلامی قوتیں اُس پر پوری طرح غالب آ کر اُسے برباد نہیں کر دیتیں۔

مغربی پریس کے اس طرزِ عمل کا اندازہ کرنے کے لیے عقل کی کوئی زیادہ مقدار درکار نہیں۔ آپ صرف گزشتہ چند سالوں کے واقعات پر نظر ڈالیں تو آپ کو حقیقتِ حال معلوم ہو جائیگی۔

ٹرکی کے سابق وزیرِ اعظم عدنان میندریس مرحوم اور اُن کی پارٹی کے لوگ اسلام کے بارے میں اتا ترک کے برعکس معاندانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کے بجائے صرف اچھے جذبات رکھتے تھے اور اُس ظلم و ستم کو ختم کرنا چاہتے تھے جو "ترکِ ناداں" اور اس کے ساتھیوں نے دینِ حق اور اس کے پیروؤں کے خلاف شروع کر رکھا تھا۔ ان حضرات کا جرم صرف اسی قدر تھا کہ اُنھوں نے عبادات اور دوسرے اسلامی احکام کی بجاآوری میں ترک عوام کو آزادی دی۔

مغربی ممالک نے جس وقت یہ دیکھا کہ عدنان میندریس اور اس کی پارٹی مسلمانوں کے دینی احساسات کا احترام کرتی ہے اور وہ عوامی خواہشات کو بروئے کار لانا چاہتی ہے تو اُن کی خبر رساں ایجنسیوں اور ان کے پریس نے فوراً اس کے خلاف پروپیگنڈے کے سارے ہتھیار سنبھال لیے اور اُسے دنیا بھر میں آزادیٔ رائے کی دشمن حکومت کی حیثیت سے بدنام کرنا شروع کر دیا۔ یہ پروگرام ایک طے بندھے منصوبے کے تحت مسلسل چلتا رہا یہاں تک کہ اس شدید اقدام کے لیے زمین ہموار ہو گئی جو مغربی قومیں چاہتی تھیں کہ میندریس اور اُس کے رفقاء کار کے خلاف کیا جائے۔ پراپیگنڈہ کے اسی طوفان میں آخرکار فوجی انقلاب برپا ہؤا اور عدنان میندریس اور اُس کے ساتھیوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ یہ کام عدل و انصاف کے سارے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حیرت انگیز عجلت کے ساتھ کیا گیا۔ لیکن وہ ممالک اور وہ خبر رساں ایجنسیاں جو عدنان میندریس کے خلاف آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھیں انہوں نے اس غیر جمہوری اور سفاکانہ طرزِ عمل کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا بلکہ اسے رجعت پسندی پر عقلیت کی فتح تصور کرتے ہوئے خوشی کے شادیانے بجائے۔

اب ذرا دوسرا رُخ دیکھیے۔ میندریس کو ہٹا کر برسرِ اقتدار آنے والی حکومت نے جس بیدردی

کے ساتھ شہری آزادیوں کو پامال کیا اس کے متعلق نہ تو ان مغربی ممالک کے پریس کو احتجاج کرنے کی توفیق نصیب ہوئی اور نہ ان کی خبر رساں ایجنسیوں نے اس ظلم وستم کے متعلق دنیا کو آگاہ کیا۔ بلکہ استبداد کے اس پورے دور میں انقلابی حکومت کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے زوردار مقالے لکھے گئے اور عاندان ملیندریس اور جنرال پاپار کے بارے میں ایسے ایسے واقعات تراش تراش کر منظرِ عام پر لائے گئے جن سے مقصود یہ تھا کہ جسٹس پارٹی ذلیل اور بدنام ہو اور عوام کے اندر یہ احساس پیدا ہو کر چلو اچھا ہوا کہ ایک ظالم جماعت کا قلع قمع ہوگیا۔ اس پورے عرصے میں ان خبر رساں ایجنسیوں کو ایک مرتبہ بھی شہری آزادیوں کے تحفظ، انسانی بنیادی حقوق کے احترام اور جمہوری اقدار کی حمایت کا خیال نہ آیا اور ملک کے اندر ظلم وستم کی چکی ایسی خاموشی کے ساتھ چلتی رہی کہ دنیا کو کانوں کان بھی اس کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ اب ایک عوامی حکومت کے قیام کے بعد یہ راز افشا ہوا ہے کہ جن لوگوں نے شہری آزادیوں کا گلا گھونٹنے کے الزام میں ملیندریس کی حکومت کا تختہ الٹا تھا، انہوں نے ۵۰ ہزار افراد کو مقدمہ چلائے بغیر ۵ سال سے اوپر جیلوں میں قید کیے رکھا اور ان بدنصیبوں کو آج رہائی ملی ہے۔

امریکہ اور اس کے مغربی دوست اسلام کے بارے میں جو جذبات رکھتے ہیں ان کا اندازہ اس بات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ اپنے جغرافی مقام کے لحاظ سے روس کے مقابلہ میں ٹرکی ان کا سب سے زیادہ قیمتی اور کارآمد حلیف ہے۔ اگر ٹرکی روس کے اثر میں آجائے تو وہ اس کو سیدھا بحرِ ابیض (میڈیٹرینین) میں لا کھڑا کر سکتا ہے، اور اگر وہ مغربی ممالک کے ساتھ ہو تو جنگ کی حالت میں اہلِ مغرب عین روس کے پیٹ میں خنجر بھونک سکتے ہیں۔ اہلِ مغرب ٹرکی کی اس اہمیت سے خوب واقف ہیں اور اسی لیے وہ وہاں اپنا بہت بڑا سرمایہ کھپا رہے ہیں۔ ان کو یہ بھی خوب معلوم ہے کہ اگر ٹرکی میں آئیڈیالوجی کے اعتبار سے ایک خلا واقع ہو جائے تو عیسائیت یا کوئی مغربی آئیڈیالوجی اسے نہیں بھرے گی بلکہ کمیونزم اس کو بھرنے کے لیے آجائے گا اور روس کے ساتھ

ترکوں کی تاریخی عداوت اُس کا راستہ زیادہ دیر تک نہیں روک سکتی - آخر اسی عداوت کے باوجود ترکی کے حالیہ انتخابات میں ایک ایسی پارٹی تین لاکھ سے زیادہ ووٹ حاصل کر چکی ہے جو صریح اشتراکی میلانات رکھتی ہے - وہ کھلی آنکھوں سے یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ شام اور مصر کس طرح اشتراکیت کے سیلاب میں بہ چکے ہیں اور ان کے ساتھ اگر ترکی بھی بہ نکلے تو اس کے نتائج کیا ہونگے - مگر یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی وہ کسی طرح یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ترکی میں اسلام زندہ ہو - اس کا اشتراکی ہو جانا انہیں قبول - اس کا روس کی گود میں چلا جانا انہیں گوارا - مگر یہ کسی طرح قابلِ برداشت نہیں کہ ترکی مساجد کے میناروں سے عربی اذان پھر سے بلند ہونے لگے - ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ ترکی پارلیمنٹ کے اجلاس، کمالی انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ رمضان کے زمانے میں افطار کے وقت سے پہلے برخاست کیے جانے لگے تو مغربی پریس کو یہ بہت اہم خبر محسوس ہوئی اور اس نے دنیا بھر کو اس سے مطلع کرنا ضروری سمجھا - مگر اس بات میں ان کے لیے کوئی خبریت نہ تھی کہ ان کی دل پسند انقلابی حکومت ۵ سال کے دوران میں پچاس ہزار آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر قید کرتی رہی -

---

مغربی ممالک کا یہی رویہ نائجیریا کے معاملہ میں نظر آتا ہے - جب تک احمدو بیلو اور ابو بکر تفاوا بلیوا (اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے) جیسے خادم دین حضرات برسرِ اقتدار رہے اسی وقت تک مغربی پریس کو جمہوریت کا غم کھاتا رہا اور وہ برابر ان کے خلاف یہ پروپیگنڈا کرنے میں مصروف رہا کہ یہ حضرات جمہوریت کا خون کر رہے ہیں اور ان کے وجود سے جمہوری اقدار کو خطرہ لاحق ہے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات سے آزادی اور انسانی بنیادی حقوق کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا اصل میں مغرب کے لیے تشویش کی باعث یہ چیز تھی کہ نائجیریا میں مسلم اکثریت ایک موثر قوت کی حیثیت سے امورِ مملکت پر حاوی ہوتی جا رہی تھی اور اس میں غالب عنصر ایسے نیک اور خدا ترس افراد کا تھا جنہیں دنیاوی جاہ و جلال کی بہ نسبت دین عزیز تر تھا - یہ صورت حال دنیائے مغرب کو کسی طرح بھی گوارا نہ تھی - اسی وجہ سے وہ ان حضرات کے خلاف مسلسل زہر اُگلتے رہے اور انہیں اس وقت تک

سکونِ خاطر نصیب نہ ہوا جب تک کہ احمد بیلو اور ابوبکر تفاوا بلیوا جیسی عظیم شخصیتوں کو موت کے گھاٹ اتار کر عیسائی اقلیت کے چند فوجی افسر مسندِ اقتدار پر متمکن نہ ہو گئے۔ اقتدار کی اس تبدیلی کے بعد مغربی پریس وقتاً فوقتاً دنیا کو یہ خبریں سناتا رہا کہ جنرل آئرونسی حالات کو سدھارنے کے لیے کس خوبی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ مگر اس امر کا بھول کر بھی کوئی تذکرہ اس پریس میں نہ آیا کہ یہ عیسائی جنرل اکثریت پر اقلیت کو مسلط کرنے کے لیے کیا تدبیریں کر رہا ہے اور اس سے بھی کچھ جمہوری اقدار پامال ہو رہی ہیں یا نہیں۔ اس کا ذکر کرنا کیا معنی، اُلٹے اس بے انصافی کو جائز ثابت کرنے کے لیے عجیب و غریب دلائل دیئے جانے لگے۔ اب نائیجیریا میں جو تازہ انقلاب ہوا ہے اس کے بعد اہلِ مغرب کو تمام تر فکر اس بات کی ہے کہ اگر مسلم اکثریت پر غیر مسلم اقلیت حاوی نہ ہو سکے تو کم از کم یہی ہو کہ اس ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور افریقہ کے اس سب سے زیادہ آباد ملک پر مسلم اکثریت کا اقتدار قائم نہ رہنے پائے۔ یہ ہے ان ظاہر باطن لوگوں کا کردار جو ہمیں رواداری اور جمہوریت کے سبق دیتے ہیں اور دنیا میں عدل و انصاف کے علمبردار بنے پھرتے ہیں۔

یہ سب واقعات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ مغربی قوموں کو جمہوریت، آزادیٔ رائے اور بنیادی انسانی حقوق کا غم بس اُسی وقت لاحق ہوتا ہے جب دنیا میں کہیں اسلام کے لیے کوئی کام ہوتا نظر آئے۔ اسلام کی سربلندی کا خطرہ سامنے آتے ہی ان کے پیٹ میں جمہوریت کے مروڑ اُٹھنے شروع ہو جاتے ہیں اور وہ اُن قوتوں کے خلاف مکروہ پروپیگنڈے کی ناپاک مہم شروع کر دیتی ہیں جو اس "خطرے" کے پیچھے کام کرتی دکھائی دیتی ہوں لیکن اسلام کا راستہ روکنے اور اس کی اقدارِ حیات کو پامال کرنے کے لیے خواہ کتنے ہی مظالم کیے جائیں، کتنی ہی صریح بے انصافیوں کا ارتکاب کیا جائے، کیسے ہی غیر جمہوری اور غیر اخلاقی طریقے اختیار کیے جائیں، ان کے ضمیر پر جوں تک نہیں رینگتی، نہ ان کے دلوں میں کوئی معمولی ارتعاش تک پیدا ہوتا ہے۔ مصر میں آج جو کچھ ہوا ہے، اشتراکی بلاک نے اس پر خوشی کے ڈھول پیٹے ہیں اور مغربی بلاک نے اس پر آفرین و

صدر آفرین کی صدائیں بلند کی ہیں۔ کوئی آنکھ اس اندوہناک صورتِ حال پر نمناک نہیں ہوئی۔ کسی دل میں یہ احساس پیدا نہیں ہوا کہ متاعِ حیات سے محروم ہونے والے اور مصری حکام کے ہاتھوں رنگ عذاب کی سختیاں جھیلنے والے انسانی برادری ہی کے معزز ارکان ہیں اور اُن کے لیے بھی آزادی اور انصاف کے تقاضے اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنے کہ خود اِن کے لیے۔ الاخوان المسلمون کے ختم ہونے سے چونکہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہے اس لیے مغربی قومیں صدر ناصر کے اس ظالمانہ اقدام پر بڑی مسرور ہیں اور اس بات پر مطمئن ہیں کہ ناصر صاحب ان کی ناپاک خواہشات کی تکمیل میں دانستہ یا نادانستہ ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغربی پریس کی یہ روش کوئی ایسا حادثہ نہیں ہے جسے محض اتفاق پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کے اسلام دشمن طرزِ عمل میں اتنی استواری اور پائیداری ہے کہ انسانی عقل اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز باور ہی نہیں کر سکتی کہ وہ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے اندازِ فکر، بنے بندھے منصوبے اور متعین مقاصد کی تکمیل میں کر رہا ہے۔ اس کا یہ طرزِ عمل چند صحافیوں اور خبر رسانوں کے ذاتی ذوق یا رجحان کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ پُوری پُوری قوموں اور سلطنتوں کی پالیسی یہی ہے۔ بلکہ یہ اہلِ مغرب کی مشترک بین الاقوامی پالیسی ہے اور پریس اس کا ایک بڑا مؤثر آلۂ کار ہے۔ کم از کم اس معاملہ میں پریس ایک خود مختار ادارہ نہیں ہے جو اپنی قوموں کی پالیسی سے ہٹ کر اپنی کوئی الگ پالیسی چلاتا ہو۔

یہ ہو سکتا ہے کہ مغربی پریس کے مختلف مدارسِ فکر ہوں اور مختلف مفادات کے محافظ و نگراں اور مختلف افکار و نظریات کے ترجمان کی حیثیت سے یہ پریس متعدد کیمپوں میں بٹا ہوا ہو۔ ان میں باہمی سر پھٹول اور چپقلش بھی ہو سکتی ہے لیکن مسلمانوں کے معاملہ میں اس سارے پریس کے قریب قریب یکساں طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقت نہایت واضح طور پر کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ خواہ اس کے اپنے اندر کتنے ہی اختلافات پائے جائیں مگر اس ایک معاملے میں اس کے اندر

مکمل یک جہتی اور اتحاد ہے - وہ مسلمانوں کو مسلمان نہیں دیکھ سکتا- وہ اسلام کو سر اٹھاتے نہیں دیکھ سکتا- وہ اسلام کے رشتے کی بنا پر مسلمانوں کو متحد ہوتے نہیں دیکھ سکتا- وہ کسی مسلمان قوم کو طاقت پکڑتے نہیں دیکھ سکتا- جہاں بھی اسے اسلام کے ایک زندہ طاقت کی حیثیت سے اُبھرنے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے، یہ پورا پریس اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا ہے -

---

جب تک مغربی اقوام مسلمانوں پر براہِ راست مسلط رہیں اُس وقت تک تو وہ خود اپنے ہاتھ سے آزادی، حریت، انسانی بنیادی حقوق اور انصاف کا خون کرتی رہیں- اسلام اور اسلامی تحریکات کو دبانے میں ہر قسم کے ظلم سے کام لیتی رہیں- مگر انہیں اس امر کا پُوری طرح احساس تھا کہ وہ ان ممالک پر خود زیادہ دیر تک مسلط نہیں رہ سکیں گی- اور ایک نہ ایک دن ان ممالک کو آزاد ہی کرنا پڑے گا- اس لیے انہوں نے شروع ہی سے اس امر کا پوری طرح اہتمام کیا کہ اُن کے جسم کے ساتھ اُن کی رُوح یہاں سے رخصت نہ ہونے پائے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ایک طبقے کے اندر حلول کر کے اسے مغربی قوموں کے مقاصد کی تکمیل کا ایک موثر ذریعہ بنا دے- چنانچہ ان قوموں نے اپنی "روحِ بد" کا وارث بنانے کے لیے مسلمانوں کے اندر ایک ایسے طبقے کا انتخاب کیا جسے وطن، دین، ایمان، اخلاق، الغرض دنیا کی ہر چیز کے مقابلے میں اپنے مفادات عزیز تر تھے- اس بے ضمیر طبقے کو اپنا صحیح طور پر جانشین بنانے کے لیے اس کی بڑی تربیت کی گئی اور قوم کے اندر اس کے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لیے مختلف چالیں چلی گئیں- سب سے پہلے ان کی تعلیم کے لیے خاص انتظامات کیے گئے تاکہ مسلم سوسائٹی اور اُن کے درمیان زیادہ سے زیادہ بُعد اور بیگانگی پیدا ہو، وہ رنگ و نسل کے اعتبار سے مسلم معاشرے سے تعلق رکھنے کے باوجود افکار و نظریات اور احساسات جذبات کے اعتبار سے غیر ملکی ہوں، اور مغربی فرمانرواؤں کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ انہی کے سے جابرانہ طرزِ فکر کے ساتھ مسلمانوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھ کر انہیں اُسی طرح ستائیں جس طرح کہ مغربی قومیں اُنہیں دو سو سال سے ستا رہی ہیں۔ تعلیم و تربیت کے ان ابتدائی مراحل سے

گزارنے کے بعد انہیں مسلم عوام کی گردنوں پر اس طرح مسلط کیا گیا کہ وہ اپنے بھائی بندوں سے الگ تھلگ رہیں اور اپنے آپ کو برتر اور اپنے بھائیوں کو کم تر مخلوق سمجھتے ہوئے ان سے معاملہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم معاشرے کے بطن سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جسے مسلم قوم، اس کے مسائل، اس کی تہذیب و تمدن، اس کی روایات، اور اس کی قوت کے اصل محرکات سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ طبقہ عام مسلم سوسائٹی کے احساسات سے یکسر بیگانہ ہو کر رہا۔ اس کا تعلق خاطر اپنی ملت سے زیادہ دوسری قوموں سے تھا۔ اُسے ان کے مقاصد حیات، ان کے افکار و نظریات، اور ان کے طرز زندگی زیادہ عزیز تھے۔ فکر و احساس کے اس غیر فطری نشوونما نے اس طبقے کے اندر بہت سے نفسیاتی عوارض پیدا کر دیئے۔ ان سب میں بڑا عارضہ احساس کہتری ہے۔ عام مسلم سوسائٹی چونکہ انہیں اپنے ہاں عزت و احترام کا کوئی مقام دینے پر آمادہ نہ تھی اور غیر ملکی حکمران ایسے بے ضمیر طالع آزماؤں کو اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے سوا اور کسی دوسرے مصرف کے لیے مفید نہ سمجھتے تھے، اس لیے اس طبقے کے اندر بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہوا کہ اُسے اگر دنیا میں عزت کے ساتھ رہنا ہے تو اس کے لیے بس ایک ہی راستہ ہے، وہ یہ کہ وہ کسی طرح مسندِ اقتدار کے ساتھ چمٹا رہے اور اقتدار کی قوت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مادی منافع حاصل کرے اور دوسری طرف اپنی قوم کو کچلنے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرے تاکہ پوری قوم مفلوج ہو کر رہ جائے اور کوئی چیز بھی اس کی تکمیلِ ہوس میں مزاحم نہ ہو سکے۔ اسی غرض کے لیے مغربی قومیں ان طبقوں کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے مشرقی ممالک میں مسلط رکھنے پر مصر ہیں اور جہاں ان کے تسلط کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں وہ جمہوریت، آزادی رائے اور انسانی بنیادی حقوق کے وہ سارے مواعظِ حسنہ بھول جاتی ہیں جو اپنے ہاں اُن کی نظر میں دین و ایمان کی حیثیت رکھتے ہیں، جنہیں اپنے ہاں کے حکمرانوں سے تسلیم کروانے کے لیے وہ خود ایک طویل اور خوفناک کشمکش سے گزر چکی ہیں۔ اپنے ملکوں میں وہ ان حقوق کی زبردست حامی ہیں، مگر مسلمان ممالک میں ان کی ساری

ہمدردیاں ان حقوق کے علمبرداروں کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے پامال کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔ ان ملکوں کے لیے وہ جمہوریت کے بجائے آمریت کو زیادہ موزوں سمجھتی ہیں۔ ان ملکوں کے معاملہ میں وہ اکثریت کی حکومت کا اصول ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ لامحالہ مسلم قوم کے عزائم اور ارادوں کی ترجمان ہوگی۔ اس کے برعکس مغرب زدہ اقلیت کے تسلط کے قیام کے لیے ناپاک کوششیں ہوتی ہیں۔ اس اقلیت کو آزادیٔ رائے کا خون کرنے اور عوامی احساسات و جذبات کو کچلنے پر اکسایا جاتا ہے۔ جو من چلے اس کام میں زیادہ جری اور بے باک ہوں اور زیادہ سفاکی اور زبردست آزاری کا مظاہرہ کریں ان کی مدح و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ مغربی پریس ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے اور قوم کے حقیقی بہی خواہوں اور اس کی امنگوں کی ترجمانی کرنے والے مخلص خادموں کو دنیا میں رسوا اور بدنام کرنے کے لیے ہر طریقہ اور حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔

مغربی قوموں کا یہ طرزِ عمل استعمار پرستوں کے لیے بیشمار فوائد کا حامل ثابت ہوا ہے۔ مسلمان حکمرانوں اور عوام کے درمیان، اور خود ان میں بھی باہم اتحاد کی جگہ زبردست سر پھٹول شروع ہوگئی اور بھائی نے بھائی کے دکھ درد میں شریک ہونے اور دستِ تعاون بڑھانے کے بجائے اس کا گلا کاٹنا شروع کر دیا۔ اس طرح مسلم اقوام کے ذرائع و وسائل تعمیر و ترقی کی راہ پر صرف ہونے کے بجائے ایک دوسرے کو مٹانے اور برباد کرنے میں صرف ہونے لگے۔ مشرق سے مغرب تک اکثر و بیشتر مسلمان ریاستوں کو اس باہمی نزاع نے جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ لاکھوں نہیں کروڑوں اور اربوں روپے خود اپنے آپ کو تاخت و تاراج کرنے میں لگ گئے ہیں اور ابھی تک یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہونے میں آتا۔ مصر، جس کے معاشی منصوبوں کے بارے میں اتنے بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں، اُس کی معیشت بالکل برباد ہو گئی ہے۔ اُس کے میزانیہ کا ایک بہت بڑا حصہ حکمران طبقوں کی برتری کا نقش دلوں پر بٹھانے اور ان کی غلط پالیسیوں کو حق بجانب ثابت کرنے اور اُن کی شخصیتوں کو مصنوعی طور پر ابھارنے

اور عوام میں مقبول ہونے میں صرف ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ حکمرانوں کو اکثر اوقات خود ایسے جھگڑے اٹھانے پڑتے ہیں جن سے قوم کی توجہ اُن کے اعمال و افعال اور اُن کے غلط طرزِ عمل کے خطرناک نتائج سے ہٹ کر بعض دوسرے مسائل میں اُلجھ کر رہ جائے اور حکمران بڑی بے خوفی کے ساتھ عوام کو اپنی پالیسیوں کا تختۂ مشق بناتے رہیں۔ صدر ناصر نے یمن میں جو مہم جاری کر رکھی ہے اس نے مصری معیشت کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، اور مصر کو مالی اور فوجی لحاظ سے اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ اگر اسرائیل عرب ملکوں پر کوئی دست درازی کرے تو مصر اس کی مزاحمت کر سکے۔ ان حالات میں آئے دن ناصر صاحب کے قتل کی سازشوں اور ان کی جان پر حملوں کے جو نت نئے افسانے گھڑے جاتے رہے ہیں اور ناکردہ گناہوں کی پاداش میں اخوانیوں پر ظلم کے جو پہاڑ توڑے جاتے ہیں، اِس سب کے پیچھے یہ بیمار ذہنیت کام کر رہی ہے کہ روز ایک نیا ہَوّا دکھا کر لوگوں کو ان تباہ کُن پالیسیوں کے نتائج سے غافل کیا جائے اور قومی احساسات کے علی الرغم محض قوت کے بل پر لوگوں کی گردنوں پر تاحینِ حیات مسلط رہا جائے۔

ٹرکی بھی مدتِ دراز سے اسی کشمکش کی آماجگاہ بنا ہُوا ہے۔ ایک مختصر سا مغرب زدہ طبقہ ترکوں کے عوامی جذبات کے برعکس مغربی تہذیب و تمدن کی عملداری قائم کرنے کے درپے ہے مگر عوام اسے اپنی موت سمجھتے ہیں۔ انتخابات کا جب کبھی موقع ملتا ہے، عوام اپنی پسند کی اکثریت منتخب کر کے لے آتے ہیں۔ مگر جب اکثریت عوام کی مرضی کے مطابق کام کرنے لگتی ہے تو وہ چھوٹا سا طبقہ زبردستی حکومت کا تختہ الٹ دیتا ہے۔ اس باہمی آویزش میں نہ صرف ملکی دولت کی بربادی ہوئی ہے بلکہ بکثرت قیمتی جانیں بھی ضائع ہوئی ہیں۔ جان و مال کے اس زیاں اور اس کشمکش نے ٹرکی کی قوت کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور وہ ملک جس کی ہیبت سے کبھی پورا یورپ لرزتا تھا آج اپنی آزادی کو بھی بمشکل برقرار رکھ رہا ہے۔ کاش کوئی

(باقی صفحہ پر)

تفہیم القرآن

الذّاریات

(۲)

ابراہیمؑ نے کہا، اے فرستادگانِ الٰہی، کیا مہم آپ کو درپیش ہے؟[30] انہوں نے کہا "ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں[31] تاکہ اُس پر پکّی ہوئی مٹی کے پتھر برسا دیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لیے نشان زدہ ہیں[32]" ——— [33] پھر ہم نے اُن سب لوگوں کو نکال لیا جو

---

[30] چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا کسی بڑے اہم کام کے لیے ہوتا ہے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی آمد کا مقصد پوچھنے کے لیے خَطْب کا لفظ استعمال فرمایا۔ خَطْب عربی زبان میں کسی معمولی کام کے لیے نہیں بلکہ کسی امرِ عظیم کے لیے بولا جاتا ہے۔

[31] مراد ہے قومِ لُوط۔ اُس کے جرائم اس قدر بڑھ چکے تھے کہ صرف "مجرم قوم" کا لفظ ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اس سے مراد کون سی قوم ہے۔ اس سے پہلے قرآن مجید میں حسبِ ذیل مقامات پر اس کا ذکر گزر چکا ہے: تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۱ تا ۵۳ - ۳۵۵ تا ۳۵۹ - ۵۱۰ تا ۵۱۵ - جلد سوم، ص ۱۷۰ - ۵۲۶ تا ۵۳۴ - ۵۸۶ - ۵۸۷ - ۵۹۴ تا ۵۹۸ - جلد چہارم، الصافات، ص ۳۰۶۔

[32] یعنی ایک ایک پتھر پر آپ کے رب کی طرف سے نشان لگا دیا گیا ہے کہ اُسے کس مُجرم کی سرکوبی کرنی ہے۔ سورۂ ہُود اور الحِجر میں اس عذاب کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ اُن کی بستیوں کو تلپٹ کر دیا گیا اور اوپر سے پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے گئے۔ اس سے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ شدید زلزلے کے اثر سے پورا علاقہ الٹ دیا گیا، اور جو لوگ زلزلے سے بچ کر بھاگے ان کو آتش فشاں مادّے کے پتھروں کی بارش نے ختم کر دیا۔

اُس بستی میں مومن تھے، اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا[۴۴]۔ اس کے

۴۳۔ بیچ میں یہ قصہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے یہ فرشتے کس طرح حضرت لُوط کے ہاں پہنچے اور وہاں اُن کے اور قوم لُوط کے درمیان کیا کچھ پیش آیا۔ یہ تفصیلات سورۂ ہود، الحجر اور العنکبوت میں گزر چکی ہیں۔ یہاں صرف اُس آخری وقت کا ذکر کیا جا رہا ہے جب اس قوم پر عذاب نازل ہونے والا تھا۔

۴۴۔ یعنی پُوری قوم میں، اور اُس کے پُورے علاقے میں صرف ایک گھر تھا جس میں ایمان و اسلام کی روشنی پائی جاتی تھی، اور وہ تنہا حضرت لوط علیہ السلام کا گھر تھا۔ باقی پُوری قوم فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی تھی، اور اُس کا سارا ملک گندگی سے لبریز ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُس ایک گھر کے لوگوں کو بچا کر نکال لیا اور اس کے بعد اس ملک پر وہ تباہی نازل کی جس سے اس بدکار قوم کا کوئی فرد بچ کر نہ جا سکا۔

اس آیت میں تین اہم مضامین بیان ہوئے ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ کا قانونِ مکافات اُس وقت تک کسی قوم کی کامل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا جب تک اس میں کچھ قابلِ لحاظ بھلائی موجود رہے۔ بُرے لوگوں کی اکثریت کے مقابلے میں اگر ایک قلیل عنصر بھی ایسا پایا جاتا ہو جو بدی کو روکنے اور نیکی کے راستے کی طرف بلانے کے لیے کوشاں ہو، تو اللہ تعالیٰ اُسے کام کرنے کا موقع دیتا ہے اور اُس قوم کی مہلت میں اضافہ کرتا رہتا ہے جو ابھی خیر سے بالکل خالی نہیں ہوئی ہے۔ مگر جب حالت یہ ہو جائے کہ کسی قوم کے اندر آٹے میں نمک کے برابر بھی خیر باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو دو چار نیک انسان اس کی بستیوں میں بُرائی کے خلاف لڑتے لڑتے تھک کر عاجز آ چکے ہوں انہیں وہ اپنی قدرت سے کسی نہ کسی طرح بچا کر نکال دیتا ہے اور باقی لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو ہر ہوشمند مالک اپنے سڑے ہوئے پھلوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ "مسلمان" صرف اُسی اُمت کا نام نہیں ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیرو ہے، بلکہ آپ سے پہلے کے تمام انبیاء اور ان کے پیرو بھی مسلمان ہی تھے۔ ان کے ادیان الگ الگ نہ تھے کہ کوئی دینِ ابراہیمی ہو اور کوئی موسوی اور کوئی عیسوی۔ بلکہ وہ سب مُسلم تھے اور ان کا دین یہی اسلام تھا۔

بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں۔[۳۵]

قرآن مجید میں یہ حقیقت جگہ جگہ اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل آیات ملاحظہ ہوں: البقرہ، ۱۲۸، ۱۳۱-۱۳۲، ۱۳۳۔ آل عمران، ۶۷-۵۲۔ المائدہ، ۴۴، ۱۱۱۔ یونس، ۷۲، ۸۴۔ یوسف، ۱۰۱۔ الاعراف، ۱۲۶۔ النمل ۳۱-۴۲، ۴۴۔

تیسرے یہ کہ "مومن" اور "مسلم" کے الفاظ اِس آیت میں بالکل ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ اِس آیت کو اگر سورۂ حُجُرات کی آیت ۱۴ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اُن لوگوں کے خیال کی غلطی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ "مومن" اور "مسلم" قرآن مجید کی دو ایسی مستقل اصطلاحیں ہیں جو ہر جگہ ایک ہی مفہوم کے لیے استعمال ہوئی ہیں اور "مسلم" لازماً اُسی شخص کو کہتے ہیں جو ایمان کے بغیر محض بظاہر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ حُجُرات، حاشیہ ۳۱)۔

۳۵۔ اِس نشانی سے مُراد بحیرۂ مُردار (DEAD SEA) ہے جس کا جنوبی علاقہ آج بھی ایک عظیم الشان تباہی کے آثار پیش کر رہا ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا اندازہ ہے کہ قومِ لُوط کے بڑے شہر غالباً شدید زلزلے سے زمین کے اندر دھنس گئے تھے اور ان کے اوپر بحیرۂ مُردار کا پانی پھیل گیا تھا، کیونکہ اِس بحیرے کا وہ حصہ جو "اللسان" نامی چھوٹے سے جزیرہ نما کے جنوب میں واقع ہے، صاف طور پر بعد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے اور قدیم بحیرۂ مُردار کے جو آثار اِس جزیرہ نما کے شمال تک نظر آتے ہیں وہ جنوب میں پائے جانے والے آثار سے بہت مختلف ہیں۔ اِس سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جنوب کا حصہ پہلے بحیرے کی سطح سے بلند تھا، بعد میں کسی وقت دھنس کر اس کے نیچے چلا گیا۔ اس کے دھنسنے کا زمانہ بھی دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے، اور یہی تاریخی طور پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لُوطؑ کا زمانہ ہے۔ پچھلے سال ۱۹۶۵ء میں آثارِ قدیمہ کی تلاش کرنے والی ایک امریکی جماعت کو اللسان پر ایک بہت بڑا قبرستان ملا ہے جس میں ۲۰ ہزار سے زیادہ قبریں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریب میں کوئی بڑا شہر ضرور آباد ہو گا۔ مگر کسی ایسے شہر کے آثار آس پاس کہیں موجود نہیں ہیں جس

اور (تمہارے لیے نشانی ہے) موسیٰ کے قصے میں، جب ہم نے اُسے صریح سند کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا[۳۶] تو وہ اپنے بل بوتے پر اکڑ گیا اور بولا یہ جادوگر ہے یا مجنون ہے[۳۷]۔ آخر کار ہم نے اُسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا۔[۳۸]

سے متصل اتنا بڑا قبرستان بن سکتا ہو۔ اس سے بھی یہ شبہ تقویت پاتا ہے کہ جس شہر کا یہ قبرستان تھا وہ بُحَیرے میں غرق ہو چکا ہے۔ بُحیرے کے جنوب میں جو علاقہ ہے اس میں اب بھی ہر طرف تباہی کے آثار موجود ہیں اور زمین میں گندھک، رال، کول تار اور قدرتی گیس کے اتنے ذخائر پائے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کسی وقت بجلیوں کے گرنے سے یا زلزلے کا لاوا نکلنے سے یہاں ایک جہنم پھٹ پڑی ہو گی (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۵۲۹ تا ۵۳۱)۔

۳۶ یعنی ایسے صریح معجزات اور ایسی کھلی کھلی علامات کے ساتھ بھیجا جن سے یہ امر مشتبہ نہ رہا تھا کہ آپ خالقِ ارض و سما کی طرف سے مامور ہو کر آتے ہیں۔

۳۷ یعنی کبھی اس نے آپ کو ساحر قرار دیا، اور کبھی کہا کہ یہ شخص مجنون ہے۔

۳۸ اس چھوٹے سے فقرے میں تاریخ کی ایک پوری داستان سمیٹ دی گئی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ذرا چشمِ تصور کے سامنے یہ نقشہ لے آئیے کہ فرعون اس وقت دنیا کے سب سے بڑے مرکزِ تہذیب و تمدن کا عظیم فرماں روا تھا جس کی شوکت و سطوت سے گرد و پیش کی ساری قومیں خوف زدہ تھیں۔ ظاہر بات ہے کہ وہ جب اپنے لشکروں سمیت اچانک ایک روز غرقاب ہوا ہو گا تو صرف مصر ہی میں نہیں، آس پاس کی تمام قوموں میں اس واقعہ کی دھوم مچ گئی ہو گی۔ مگر اس پر بجز اُن لوگوں کے جن کے اپنے قریبی رشتہ دار غرق ہوئے تھے، باقی کوئی نہ تھا جو ان کے اپنے ملک میں، یا دنیا کی دوسری قوموں میں ماتم کرتا یا ان کا مرثیہ کہتا، یا کم از کم یہی کہنے والا ہوتا کہ افسوس، کیسے اچھے لوگ تھے جو اس حادثہ کے شکار ہو گئے۔ اس کے بجائے، چونکہ دنیا اُن کے ظلم سے تنگ آئی ہوئی تھی، اس لیے ان کے عبرتناک انجام پر ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا، ہر زبان نے ان پر ملامت کی پھٹکار برسائی، اور جس نے بھی

اور (تمہارے لیے نشانی ہے) عاد میں، جبکہ ہم نے ان پر ایک ایسی بے خیر ہوا بھیج دی کہ جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔[۳۹]

اور (تمہارے لیے نشانی ہے) ثمود میں جب اُن سے کہا گیا تھا کہ ایک خاص وقت تک مزے کر لو[۴۰]۔ مگر اس تنبیہ پر بھی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی۔ آخر کار ان کے

اس خبر کو سُنا وہ پکار اُٹھا کہ یہ ظالم اسی انجام کے مستحق تھے۔ سورۂ دُخان میں اسی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ "پھر نہ آسمان ان پر رویا اور نہ زمین۔" (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ دخان، حاشیہ ۲۵)

۳۹۔ اس ہوا کے لیے لفظ عَقِیم استعمال ہُوا ہے جو بانجھ عورت کے لیے بولا جاتا ہے، اور لغت میں اس کے اصل معنی یابس (خشک) کے ہیں۔ اگر اسے لُغوی معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایسی سخت گرم و خشک ہوا تھی کہ جس چیز پر سے وہ گزر گئی اُسے سُکھا کر رکھ دیا۔ اور اگر اسے محاورے کے مفہوم میں لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ بانجھ عورت کی طرح وہ ایسی ہوا تھی جو اپنے اندر کوئی نفع نہ رکھتی تھی۔ نہ خوشگوار تھی، نہ بارش لانے والی، نہ درختوں کو بار آور کرنے والی، اور نہ اُن فائدوں میں سے کوئی فائدہ اُس میں تھا جن کے لیے ہوا کا چلنا مطلوب ہوتا ہے۔ دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ یہ صرف بے خیر اور خشک ہی نہ تھی بلکہ نہایت شدید آندھی کی شکل میں آئی تھی جس نے لوگوں کو اٹھا اٹھا کر پٹخ دیا، اور یہ مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک چلتی رہی، یہاں تک کہ قوم عاد کے پورے علاقے کو اس نے تہس نہس کر کے رکھ دیا (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ حٰم السجدہ، حواشی نمبر ۲۰-۲۱۔ الاحقاف، حواشی نمبر ۲۵ تا ۲۸)

۴۰۔ مفسّرین میں اس امر پر اختلاف ہے کہ اِس سے مراد کون سی مہلت ہے۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ یہ اشارہ سورۂ ہود کی اُس آیت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ثمود کے لوگوں نے جب حضرت صالح کی اونٹنی کو ہلاک کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خبردار کر دیا گیا کہ تین دن تک مزے کر لو، اس کے بعد تم پر عذاب آجائے گا۔ بخلاف اس کے حضرت حسن بصری کا خیال ہے کہ یہ بات

دیکھتے دیکھتے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب[۴۳] نے اُن کو آلیا، پھر نہ اُن میں اٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے[۴۴]۔

اور ان سب سے پہلے ہم نے نوح کی قوم کو ہلاک کیا کیونکہ وہ فاسق لوگ تھے ۔ع

آسمان[۴۵] کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں[۴۶]۔ زمین کو ہم نے

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی دعوت کے آغاز میں اپنی قوم سے فرمائی تھی اور اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم توبہ و ایمان کی راہ اختیار نہ کرو گے تو ایک خاص وقت تک ہی تم کو دنیا میں عیش کرنے کی مہلت نصیب ہو سکے گی اور اس کے بعد تمہاری شامت آجائے گی۔ ان دونوں تفسیروں میں سے دوسری تفسیر ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بعد کی آیت فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ (پھر انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی) یہ بتاتی ہے کہ جس مہلت کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ سرتابی سے پہلے دی گئی تھی اور انہوں نے سرتابی اس تنبیہ کے بعد کی۔ اس کے برعکس سورۂ ہود والی آیت میں تین دن کی جس مہلت کا ذکر کیا گیا ہے وہ ان ظالموں کی طرف سے آخری اور فیصلہ کن سرتابی کا ارتکاب ہو جانے کے بعد دی گئی تھی۔

۴۳؎ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس عذاب کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں اسے رَجْفَه (دہلا دینے والی اور ہلا مارنے والی آفت) کہا گیا ہے۔ کہیں اس کو صَیْحَه (دھماکے اور کڑکے) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہیں اس کے لیے طاغیہ (انتہائی شدید آفت) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہاں اسی کو صَاعِقَه کہا گیا ہے جس کے معنی بجلی کی طرح اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کے بھی ہیں اور سخت کڑک کے بھی۔ غالباً یہ عذاب ایک ایسے زلزلے کی شکل میں آیا تھا جس کے ساتھ خوفناک آواز بھی تھی۔

۴۴؎ اصل الفاظ ہیں مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ۔ انتصار کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے حملہ سے بچانا۔ اور دوسرے معنی ہیں حملہ کرنے والے سے بدلہ لینا۔

بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں۔[۴۵] اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں،[۴۶] شاید کہ تم اس سے سبق لو۔[۴۷] پس دوڑو اللہ کی طرف، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف

---

[۴۳] آخرت کے حق میں تاریخی دلائل پیش کرنے کے بعد اب پھر اسی کے ثبوت میں آفاقی دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔

[۴۴] اصل الفاظ ہیں وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ۔ مُوْسِع کے معنی طاقت و مقدرت رکھنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں اور وسیع کرنے والے کے بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ آسمان ہم نے کسی کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے زور سے بنایا ہے اور اس کی تخلیق ہماری مقدرت سے باہر نہ تھی۔ پھر یہ تصور تم لوگوں کے دماغ میں آخر کیسے آ گیا کہ ہم تمہیں دوبارہ پیدا نہ کر سکیں گے؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو ہم بس ایک دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ مسلسل اس میں توسیع کر رہے ہیں اور ہر آن اس میں ہماری تخلیق کے نئے نئے کرشمے رونما ہو رہے ہیں۔ ایسی زبردست خلّاق ہستی کو آخر تم نے اعادۂ خلق سے عاجز کیوں سمجھ رکھا ہے؟

[۴۵] اس کی تشریح حاشیہ ۱۸ میں گزر چکی ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۵۹۰ تا ۵۹۲۔ جلد چہارم، تفسیر سورۂ یٰس، حاشیہ ۲۹۔ الزُّخرُف، حواشی ۷ تا ۱۰۔

[۴۶] یعنی دنیا کی تمام اشیا تزویج کے اصول پر بنائی گئی ہیں۔ یہ سارا کارخانۂ عالم اِس قاعدے پر چل رہا ہے کہ بعض چیزوں کا بعض چیزوں سے جوڑ لگتا ہے اور پھر اُن کا جوڑ لگنے ہی سے طرح طرح کی ترکیبات وجود میں آتی ہیں۔ یہاں کوئی شے بھی ایسی منفرد نہیں ہے کہ دوسری کوئی شے اس کا جوڑ نہ ہو، بلکہ ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰس، حاشیہ ۳۱۔ الزُّخرُف، حاشیہ ۱۲)۔

[۴۷] مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کا تزویج کے اصول پر بنایا جانا، اور دنیا کی تمام اشیا کا زوج زوج ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو آخرت کے وجوب پر صریح شہادت دے رہی ہے۔ اگر تم غور کرو تو اس سے خود تمہاری عقل یہ نتیجہ اخذ کر سکتی ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز کا ایک جوڑا ہے، اور کوئی چیز

خبردار کرنے والا ہوں۔ اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود، مَیں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔[۴۸]

اپنے جوڑے سے ملے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوتی، تو دنیا کی یہ زندگی کیسے بے جوڑ ہو سکتی ہے؟ اس کا جوڑا لازماً آخرت ہے۔ وہ نہ ہو تو یہ قطعاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

آگے کے مضمون کو سمجھنے کے لیے اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ یہاں تک ساری بحث آخرت کے موضوع پر چلی آرہی ہے، لیکن اسی بحث اور انہی دلائل سے توحید کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ بارش کا انتظام، زمین کی ساخت، آسمان کی تخلیق، انسان کا اپنا وجود، کائنات میں قانونِ تزویج کی حیرت انگیز کارفرمائی، یہ ساری چیزیں جس طرح آخرت کے امکان و وجوب پر گواہ ہیں اُسی طرح یہی اس بات کی شہادت بھی دے رہی ہیں کہ یہ کائنات نہ بے خدا ہے اور نہ اس کے بہت سے خدا ہیں، بلکہ ایک خدائے حکیم و قادرِ مطلق ہی اس کا خالق اور مالک اور مدبّر ہے۔ اس لیے آگے انہی دلائل کی بنیاد پر توحید کی دعوت پیش کی جا رہی ہے۔ علاوہ بریں آخرت کو ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا سے بغاوت کا رویّہ چھوڑ کر اطاعت و بندگی کی راہ اختیار کرے۔ وہ خدا سے اُسی وقت تک پھرا رہتا ہے جب تک وہ اِس غفلت میں مبتلا رہتا ہے کہ مَیں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں اور اپنی دنیوی زندگی کے اعمال کا کوئی حساب مجھے کسی کو دینا نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی جس وقت بھی رفع ہو جائے، اس کے ساتھ ہی فوراً آدمی کے ضمیر میں یہ احساس اُبھر آتا ہے کہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر وہ بڑی بھاری غلطی کر رہا تھا اور یہ احساس اُسے خدا کی طرف پلٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اِسی بنا پر آخرت کے دلائل ختم کرتے ہی معاً بعد یہ فرمایا گیا "پس دوڑو اللہ کی طرف"۔

[۴۸] یہ فقرے اگرچہ اللہ ہی کا کلام ہیں مگر ان میں متکلم اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا بات دراصل یوں ہے کہ اللہ اپنے نبی کی زبان سے یہ کہلوا رہا ہے کہ دوڑو اللہ کی طرف، مَیں تمہیں اُس کی طرف سے خبردار کرتا ہوں۔ اِس طرزِ کلام کی مثال قرآن کی اوّلین سورۃ، یعنی سورۂ فاتحہ میں موجود ہے جس میں کلام تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے مگر متکلم کی حیثیت سے بندے عرض کرتے ہیں: اِيَّاكَ نَعْبُدُ

یونہی ہوتا رہا ہے، ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون[۴۹]۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں[۵۰]۔ پس اے نبی، ان سے رخ پھیر لو، تم پر کچھ ملامت نہیں[۵۱]۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ، اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ جس طرح وہاں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ "اے اہل ایمان تم اپنے رب سے یوں دعا مانگو"، مگر فحوائے کلام سے خود بخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ ایک دعا ہے جو اللہ اپنے بندوں کو سکھا رہا ہے، اُسی طرح یہاں بھی یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ "اے نبی تم ان لوگوں سے کہو" مگر فحوائے کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ توحید کی ایک دعوت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ اس طرزِ کلام کی اور بھی متعدد نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں کلام تو اللہ ہی کا ہوتا ہے مگر متکلم کہیں فرشتے ہوتے ہیں اور کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور اس امر کی تصریح کے بغیر کہ یہاں متکلم کون ہے، سیاقِ عبارت سے خود بخود یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ اپنا یہ کلام کس کی زبان سے ادا کرا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ مریم ۶۴-۶۵۔ الصّافّات ۱۵۹ تا ۱۶۷۔ الشوریٰ ۱۰۔

[۴۹] یعنی آج پہلی مرتبہ ہی یہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی زبان سے آخرت کی خبر اور توحیدِ الٰہ کی دعوت سن کر لوگ اسے ساحر اور مجنون کہہ رہے ہیں۔ رسالت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ جب سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے رسول آنے شروع ہوئے ہیں، آج تک جاہل لوگ اسی ایک حماقت کا پوری یکسانی کے ساتھ اعادہ کیے چلے جا رہے ہیں۔ جس رسول نے بھی آ کر خبردار کیا کہ تم بہت سے خداؤں کے بندے نہیں ہو بلکہ صرف ایک ہی خدا تمہارا خالق و معبود اور تمہاری قسمتوں کا مالک و مختار ہے، جاہلوں نے شور مچا دیا کہ یہ جادوگر ہے جو اپنے افسوں سے ہماری عقلوں کو بگاڑنا چاہتا ہے۔ جس رسول نے بھی آ کر خبردار کیا کہ تم غیر ذمہ دار بنا کر دنیا میں نہیں چھوڑ دیئے گئے ہو بلکہ اپنا کارنامۂ حیات ختم کرنے کے بعد تمہیں اپنے خالق و مالک کے سامنے حاضر ہو کر اپنا حساب دینا ہے اور اس حساب کے نتیجہ میں اپنے اعمال کی جزا و سزا پانی ہے، نادان لوگ چیخ اُٹھے کہ یہ پاگل ہے، اِس کی عقل ماری گئی ہے، بھلا مرنے

کے بعد ہم کہیں دوبارہ بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔

۵۰ یعنی یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہزار ہا برس تک ہر زمانے میں مختلف ملکوں اور قوموں کے لوگوں کا دعوتِ انبیاء کے مقابلے میں ایک ہی رویّہ اختیار کرنا، اور ایک ہی طرح کی باتیں اُن کے خلاف بنانا کچھ اس بنا پر تو نہ ہو سکتا تھا کہ ایک کانفرنس کر کے اِن سب اگلی اور پچھلی نسلوں نے آپس میں یہ طے کر لیا ہو کہ جب کوئی نبی آکر یہ دعوت پیش کرے تو اس کا یہ جواب دیا جائے۔ پھر اُن کے رویّے کی یہ یکسانی اور ایک ہی طرزِ جواب کی یہ مسلسل تکرار کیوں ہے؟ اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ طغیان و سرکشی ان سب کا مشترک وصف ہے۔ چونکہ ہر زمانے کے جاہل لوگ خدا کی بندگی سے آزاد اور اُس کے محاسبہ سے بے خوف ہو کر دنیا میں شترِ بے مہار کی طرح جینے کے خواہاں رہے ہیں، اس لیے اور صرف اسی لیے جس نے بھی اُن کو خدا کی بندگی اور خدا ترسانہ زندگی کی طرف بلایا اس کو وہ ایک ہی لگا بندھا جواب دیتے رہے۔

اِس ارشاد سے ایک اور اہم حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ضلالت اور ہدایت، نیکی اور بدی، ظلم اور عدل اور ایسے ہی دوسرے اعمال کے جو محرکات نفسِ انسانی میں بالطبع موجود ہیں اُن کا ظہور ہمیشہ ہر زمانے میں اور زمین کے ہر گوشے میں ایک ہی طرح ہوتا ہے، خواہ ذرائع و وسائل کی ترقی سے اس کی شکلیں بظاہر کتنی ہی مختلف نظر آتی ہوں۔ آج کا انسان خواہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں اور ہائیڈروجن بموں کے ذریعہ سے لڑے اور قدیم زمانے کا انسان چاہے پتھروں اور لاٹھیوں سے لڑتا ہو، مگر انسانوں کے درمیان جنگ کے بنیادی محرکات میں سرِ مُو فرق نہیں آیا ہے۔ اِسی طرح آج کا ملحد اپنے الحاد کے لیے دلائل کے خواہ کتنے ہی انبار لگاتا رہے، اُس کے اِس راہ پر جانے کے محرکات بعینہٖ وہی ہیں جو آج سے ۶ ہزار برس پہلے کے کسی مُلحد کو اس طرف لے گئے تھے اور بنیادی طور پر وہ اپنے استدلال میں بھی اپنے سابق پیشواؤں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

۵۱ اس آیت میں دین کی تبلیغ کا ایک قاعدہ بیان فرمایا گیا ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ایک داعیٔ حق جب کسی شخص کے سامنے معقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوت صاف صاف پیش کر دے اور

البتہ نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے۔ ؎۵۲

اس کے شبہات واعتراضات اور دلائل کا جواب بھی دے دے تو حق واضح کرنے کا جو فرض اس کے ذمّے تھا اس سے وہ سبکدوش ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد بھی اگر وہ شخص اپنے عقیدہ و خیال پر جما رہے تو اس کی کوئی ذمّہ داری داعیٔ حق پر عائد نہیں ہوتی۔ اب کچھ ضرور نہیں کہ وہ اُسی شخص کے پیچھے پڑا رہے، اُسی سے بحث میں اپنی عمر کھپائے چلا جائے، اور اس کا کام بس یہ رہ جائے کہ اُس ایک آدمی کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ داعی اپنا فرض ادا کر چکا۔ وہ نہیں مانتا تو نہ مانے۔ اس کی طرف التفات نہ کرنے پر داعی کو یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ تم نے ایک آدمی کو گمراہی میں مبتلا رہنے دیا، کیونکہ اب اپنی گمراہی کا وہ شخص خود ذمّہ دار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ قاعدہ اس لیے بیان نہیں کیا گیا ہے کہ معاذ اللہ آپ اپنی تبلیغ میں بیجا طریقے سے لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے روکنا چاہتا تھا۔ دراصل اس کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک داعیِ حق جب کچھ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے سمجھانے کا حق ادا کر چکتا ہے اور ان کے اندر ضد اور جھگڑالو پن کے آثار دیکھ کر اُن سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس پر الزام رکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ واہ صاحب، آپ اچھے دعوتِ حق کے علمبردار ہیں، ہم آپ سے بات سمجھنے کے لیے بحث کرنا چاہتے ہیں، اور آپ ہماری طرف التفات نہیں کرتے۔ حالانکہ اُن کا مقصد بات کو سمجھنا نہیں بلکہ اپنی بحثا بحثی میں داعی کو اُلجھانا اور محض اس کی تضیع اوقات کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلامِ پاک میں بالفاظِ صریح یہ فرما دیا کہ "ایسے لوگوں کی طرف التفات نہ کرو، اُن سے بے التفاتی کرنے پر تمہیں کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی"۔ اس کے بعد کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ الزام نہیں دے سکتا تھا کہ جو کتاب آپ لے کر آئے ہیں اس کی رُو سے تو آپ ہم کو اپنا دین سمجھانے پر مامور ہیں، پھر آپ ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

؎۵۲ اس آیت میں تبلیغ کا دوسرا قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ دعوتِ حق کا اصل مقصد اُن

میں نے جنّ اور انسانوں کو اِس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔۵۳ میں اُن سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔۵۴ اللہ

سعید روحوں تک ایمان کی نعمت پہنچاتا ہے جو اس نعمت کی قدرشناس ہوں اور اُسے خود حاصل کرنا چاہیں۔ مگر داعی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی معاشرے کے ہزاروں لاکھوں افراد میں وہ سعید روحیں کہاں ہیں۔ اس لیے اُس کا کام یہ ہے کہ اپنی دعوتِ عام کا سلسلہ برابر جاری رکھے تاکہ جہاں جہاں بھی ایمان قبول کرنے والے افراد موجود ہوں وہاں اس کی آواز پہنچ جائے۔ یہی لوگ اس کی اصل دولت ہیں۔ انہی کی تلاش اس کا اصل کام ہے۔ اور انہی کو سمیٹ سمیٹ کر خدا کے راستے پر لا کھڑا کرنا اس کے پیشِ نظر ہونا چاہیے۔ بیچ میں اولادِ آدم کا جو فضول عنصر اس کو ملے اُس کی طرف بس اُسی وقت تک داعی کو توجہ کرنی چاہیے جب تک اُسے تجربے سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ جنسِ کاسد ہے۔ اُس کے کساد و فساد کا تجربہ ہو جانے کے بعد اُسے پھر اپنا قیمتی وقت اِس جنس کے لوگوں پر ضائع نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ اُس کی تذکیر سے نفع اٹھانے والے لوگ نہیں ہیں، اور ان پر اپنی قوت صرف کرنے سے نقصان اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو اس سے نفع اٹھانے والے ہیں۔

۵۳ یعنی میں نے اِن کو دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ میری بندگی تو ان کو اس لیے کرنی چاہیے کہ میں اِن کا خالق ہوں۔ دوسرے کسی نے جب اِن کو پیدا نہیں کیا ہے تو اُس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ یہ اُس کی بندگی کریں، اور اِن کے لیے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اِن کا خالق تو ہوں میں اور یہ بندگی کرتے پھریں دوسروں کی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف جنوں اور انسانوں ہی کا خالق تو نہیں ہے بلکہ سارے جہان اور اس کی ہر چیز کا خالق ہے، پھر یہاں صرف جنوں اور انسانوں ہی کے متعلق کیوں فرمایا گیا کہ میں نے ان کو اپنے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؟ حالانکہ مخلوقات کا ذرّہ ذرّہ اللہ ہی کی بندگی کے لیے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زمین پر صرف جن اور انسان ایسی مخلوق ہیں جن کو یہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا چاہیں تو کریں، ورنہ وہ بندگی

سے مُنہ بھی موڑ سکتے ہیں، اور اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی بھی کر سکتے ہیں۔ دوسری جتنی مخلوقات بھی اس دنیا میں ہیں وہ اِس نوعیت کی کوئی آزادی نہیں رکھتیں۔ اُن کے لیے سرے سے کوئی دائرۂ اختیار ہے ہی نہیں کہ وہ اس میں اللہ کی بندگی نہ کریں یا کسی اور کی بندگی کر سکیں۔ اس لیے یہاں صرف جنوں اور انسانوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیار کے حدود میں اپنے خالق کی اطاعت و عبُودیت سے مُنہ موڑ کر، اور خالق کے سوا دوسروں کی بندگی کر کے خود اپنی فطرت سے لڑ رہے ہیں، اُن کو یہ جاننا چاہیے کہ وہ خالق کے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں اور ان کے لیے سیدھی راہ یہ ہے کہ جو آزادی انہیں بخشی گئی ہے اسے غلط استعمال نہ کریں بلکہ اس آزادی کے حدود میں بھی خود اپنی مرضی سے اُسی طرح خدا کی بندگی کریں جس طرح اُن کے جسم کا رونگٹا رونگٹا ان کی زندگی کے غیر اختیاری حدود میں اُس کی بندگی کر رہا ہے۔

عبادت کا لفظ اس آیت میں محض نماز روزے اور اسی نوعیت کی دوسری عبادات کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کا مطلب یہ لے کہ جن اور انسان صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے اور تسبیح و تہلیل کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ مفہوم بھی اگرچہ اس میں شامل ہے، مگر یہ اس کا پورا مفہوم نہیں ہے۔ اس کا پُورا مفہوم یہ ہے کہ جن اور انسان اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش، اطاعت، فرمانبرداری اور نیاز مندی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا، کسی اور کے احکام بجا لانا، کسی اور سے تقویٰ کرنا، کسی اور کے بنائے ہوئے دین کی پیروی کرنا، کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھنا، اور کسی دوسری ہستی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۶۳۔ الزُمر، حاشیہ ۲۔ الجاثیہ، حاشیہ ۳۰)

ایک اور بات جو ضمنی طور پر اس آیت سے صاف ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جن انسانوں سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے۔ اِس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو قرآن میں جن کہا گیا ہے۔ اِسی حقیقت پر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات بھی ناقابلِ انکار شہادت بہم پہنچاتی ہیں: الانعام، ۱۰۰، ۱۲۸۔ الاعراف ۳۸، ۱۷۹۔ ہود، ۱۱۹۔ الحجر، ۲۷ تا ۳۳۔ بنی اسرائیل، ۸۸۔ الکہف، ۵۰۔ السجدہ، ۱۳۔ سبا، ۴۱۔ صٓ، ۷۵، ۷۶۔ حٰم السجدہ، ۲۵۔ الاحقاف، ۱۸۔ الرحمٰن، ۱۵، ۳۹، ۵۶۔ (اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن،

تو خود ہی رزاق ہے، بڑی قوت والا اور زبردست[۵۵]۔ پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے[۵۶] ان کے حصے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے جیسا انہی جیسے لوگوں کو ان کے حصے کا مل چکا ہے، اس کے لیے یہ لوگ مجھ سے جلدی نہ مچائیں[۵۷]۔ آخر کو تباہی ہے کفر کرنے والوں کے لیے اُس روز جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے۔ ع

جلد سوم، ص ۱۷۷-۱۷۸-۵۶۲-۵۶۳-۵۷۵-۵۷۶-جلد چہارم، تفسیر سورہ سبا، حاشیہ ۲۴)

[۵۴] یعنی میری کوئی غرض جنوں اور انسانوں سے اٹکی ہوئی نہیں ہے کہ یہ میری عبادت کریں گے تو میری خدائی چلے گی اور یہ میری بندگی سے منہ موڑ لیں گے تو میں خدا نہ رہوں گا۔ میں ان کی عبادت کا محتاج نہیں ہوں بلکہ میری عبادت کرنا خود ان کی اپنی فطرت کا تقاضا ہے، اسی کے لیے یہ پیدا کیے گئے ہیں اور اپنی فطرت سے لڑنے میں ان کا اپنا نقصان ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ "میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں"، اس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ خدا سے برگشتہ لوگ دنیا میں جن جن کی بندگی بجا لا رہے ہیں، وہ سب درحقیقت اپنے ان بندوں کے محتاج ہیں۔ یہ اُن کی خدائی نہ چلائیں تو ایک دن بھی وہ نہ چلے۔ وہ ان کے رازق نہیں بلکہ اُلٹے یہ اُن کو رزق پہنچاتے ہیں۔ وہ ان کو نہیں کھلاتے بلکہ اُلٹے یہ اُن کو کھلاتے ہیں۔ وہ ان کی جان کے محافظ نہیں بلکہ اُلٹے یہ اُن کی جانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کے لشکر یہ ہیں جن کے بل پر اُن کی خدائی چلتی ہے۔ جہاں بھی ان جھوٹے خداؤں کی حمایت کرنے والے بندے نہ رہے، یا بندوں نے ان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا وہاں ان کے سب ٹھاٹھ پڑے رہ گئے اور دنیا کی آنکھوں نے اُن کی کس مپرسی کا حال دیکھ لیا۔ سارے معبودوں میں اکیلا ایک اللہ جل شانہٗ ہی وہ حقیقی معبود ہے جس کی خدائی اپنے بل بوتے پر چل رہی ہے، جو اپنے بندوں سے کچھ لیتا نہیں بلکہ وہی اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے

[۵۵] اصل میں لفظ "متین" استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں مضبوط اور غیر متزلزل، جسے کوئی ہلا نہ سکتا ہو۔

[۵۶] ظلم سے مراد یہاں حقیقت اور صداقت پر ظلم کرنا، اور خود اپنی فطرت پر ظلم کرنا ہے۔ سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ یہاں ظلم کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو خداوند عالم کے سوا دوسروں کی بندگی کر رہے ہیں، جو آخرت کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو دنیا میں غیر ذمہ دار سمجھ رہے ہیں، اور اُن انبیاء کو جھٹلا رہے ہیں جنہوں نے ان کو حقیقت سے خبردار کرنے کی کوشش کی ہے۔

[۵۷] یہ جواب ہے کفار کے اس مطالبہ کا کہ وہ یوم الجزا کہاں آتے آتے رہ گیا ہے، آخر وہ آ کیوں نہیں جاتا۔

افریقیہ میں اسلام کا ماضی

از جناب خلیل حامدی صاحب

(۳)

الحاج عمر کبا ۱۸۳۸ء میں "فوتا" کے حکمران خاندان میں ایک جلیل القدر شخصیت کا ظہور ہوا۔ یہ الحاج عمر کبا تھے جنہوں نے مغربی سوڈان کی تاریخ میں نہایت زبردست کردار ادا کیا ہے۔ یہ قبیلہ ٹکویر کے ایک مُرابطی شیخ کے گھر ۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ یہ قبیلہ دریائے سینی گال کے بائیں کنارے ڈیمار کے علاقہ میں بستا تھا۔ تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی۔ ۱۸۲۷ء میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینۃ النبیؐ سے مشرف ہوئے۔ ازہر میں کچھ عرصہ تک قیام کیا۔ ۱۸۳۳ء میں بُرنو (چاڈ)، کابون اور فرنچ سوڈان، گئے۔ وہاں سے ہوسا قبائل میں داخل ہوئے۔ اس پُورے سفر میں انہوں نے وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور لوگوں کو عقیدۂ سلف کی دعوت دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فرانسیسی استعمار سینی گال پر قابض ہو کر سوڈان کے اندرونی علاقوں میں بڑھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ موصوف نے وہاں سے فوتا گالون (گنییا) کا رُخ کیا۔ فوتا گالون میں ایک رباط قائم کی۔ جو عبادت کا مرکز بھی تھی اور اسلامی علوم کا مدرسہ، تجارتی سرگرمیوں کا مرکز اور جہاد کی تیاریوں کی تربیت گاہ بھی۔ الحاج عمر کبا کی سلفی دعوت اور تحریکِ توحید سے خلقِ کثیر متاثر ہوئی اور ایک بہت بڑی جماعت اُن کے گرد جمع ہو گئی۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور حالات کا اندازہ لگا کر جدید ترین اسلحہ کا استعمال بھی سیکھا۔ یہ اسلحہ وہ یورپی تاجروں سے خریدتے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں الحاج عمر کی تحریک نقطۂ عروج پر تھی۔ چنانچہ انہوں نے فوتا گالون کے شہر ڈنگیوری (DINGUIRAY) میں جو نیجر کے شمال میں تھا ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا اور سوڈان کی بُت پرست مملکتوں کے خلاف

اعلان جہاد کر دیا۔

الحاج عمر کبا نے بمبارا کے بُت پرست قبائل کو شکست دی اور کوناکری (فرنچ گینیا) کو فتح کر لیا۔ ۱۸۵۴ء میں انہوں نے نیور رو (بالائی سینی گال کا فرنچ سوڈان سے ملتا ہوا علاقہ) کو اپنا جنرل ہیڈ کوارٹر بنایا اور دریائے سینی گال کے طاس کے علاقوں کو اپنی دعوت کے لیے منتخب کیا۔ مگر ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۹ء میں فرانس کی سرگرمیاں ان علاقوں میں اس حد تک بڑھ چکی تھیں کہ انہوں نے الحاج عمر کی پیش قدمی کو روک دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مشرقی حصوں کا رُخ کیا اور مملکت سیجو اور مسینیا کو فتح کیا۔ یہ مملکتیں بت پرست اقتدار کے تحت تھیں اور ان کی عام آبادیاں مسلمان ہو چکی تھیں۔ ان تمام مملکتوں پر مشتمل انہوں نے اسلامی ریاست قائم کی۔ اور بالآخر انہی کوششوں کے نتیجے میں موصوف ۱۸۶۴ء میں شہید ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے لڑکوں اور بھتیجوں نے کام کو سنبھالا۔ مگر اُن کی باہمی رسہ کشی ملک میں انتشار برپا کرنے کی موجب ہوئی۔ ان کے لڑکے احمدو نے (جو سلطان سکوتو کی بیٹی کے بطن سے تھے) حالات کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی مگر فرانسیسیوں نے اپنے برتر اسلحہ کی مدد سے ۱۸۹۲ء میں احمدو کو شکست دے دی اور فوتا گالون کی مُسلم آزاد ریاستوں کا جو ۱۷۲۰ء سے چلی آ رہی تھیں خاتمہ کر دیا۔ احمدو کی شکست کے بعد فرانسیسیوں کو اس پوری سلطنت پر قابض ہونے کا موقع مل گیا۔ اور میڈنگو کے فرمانروا اسکمری کے ماسوا (جس نے ۱۶ سال تک (۱۸۸۲ء۔۱۸۹۸ء) فرانس کا مقابلہ کیا) کوئی طاقت فرانس کی پیشقدمی کو نہ روک سکی۔

امام الصمد | انیسویں صدی کے دوسرے ثلث میں سنگامیا کے جنوب میں مانڈگو قبیلہ کے ایک مصلح نے دعوتِ اسلامی کی ایک زبردست تحریک برپا کی (۱۸۴۶ ۔۔۔۱۹۰۰ء)۔ ان کا نام امام الصمد تھا مگر سمدی کے نام سے مشہور تھے۔ اصل میں وہ ایک بُت پرست خوشحال سپاہی تھے۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ بعد میں مسلمان ہو گئے اور دعوتِ اسلامی کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ کئی بت پرست قبائل اُن کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ انہوں نے سنگامیا کے جنوب میں بالائی نیجر اور بحیر اطلانتک کے درمیانی علاقوں میں ایک سلطنت قائم کر دی۔ ۱۸۸۱ء میں امام الصمد کی طاقت

عروج پر تھی۔ انہوں نے فرانسیسیوں کو گنی اور اس کے اطراف کے علاقوں میں بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن آخر کار ۱۸۹۳ء میں ان کے دار الحکومت بسانڈگو پر (جو لائبیریا کی سرحد پر واقع تھا)، دشمنوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ان کی فرانسیسیوں کے ساتھ کئی جنگیں ہوئیں۔ بالآخر ۱۸۹۸ء میں وہ فرانسیسی فوج کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ اور وہ آخری آواز بھی ختم ہو گئی جو مغربی افریقہ میں فرانس کے نفوذ کو روکنے کے لیے اٹھی تھی۔

عمرو کِبّا ثانی بیسویں صدی کے اوائل میں ایک مُرابطی نوجوان عمرو کبّا (UMARU KIBBA) نے بمبارا قبائل میں دعوت و تجدید کا کام شروع کیا لیکن ناکام ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے "اخوان" کے نام سے ایک مذہبی جماعت منظم کی جس کا تعلق قادریہ سلسلہ سے تھا اور دوبارہ بمبارا کے بُت پرستوں کو اسلام کی دعوت دی۔ عمرو کی دعوت مسلسل پھیل رہی تھی اور مملکت سینسنڈنگ (SANSANADING) کی ایک پوری بُت پرست بستی حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔ مگر اس علاقہ کے والی نے دعوت کی مقبولیت کو دیکھ کر عمرو کبا کو ملک بدر کر دیا اور جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے اُنہیں اپنے قدیم عقائد کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کر دیا۔

افریقہ میں اسلامی علوم اور تہذیب کے مراکز یہ چند کوششیں ہم نے مختصراً بیان کی ہیں۔ ان کے علاوہ صوفیاء کا کام بھی اِس دور میں بڑے وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ سنوسی تحریک، تیجانیہ اور قادریہ حلقے، مہدی سوڈانی کی دعوت اور سینکڑوں صالحین کی جدّوجہد سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ہم ایک اور پہلو سے بھی مغربی افریقہ کی مسلمان آبادیوں کا تعارف کراتے ہیں۔ مغربی افریقہ میں متعدد ایسے اسلامی مرکز وجود میں آئے ہیں جنہوں نے افریقہ میں اسلامی تہذیب و تمدن، اور علوم و فنون کی روشنی عام کرنے میں وہ مرتبہ حاصل کیا ہے جو مغرب میں قُرطبہ، اور مشرق میں قاہرہ و بغداد کو حاصل رہا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مغربی افریقہ کے یہ مراکز آج تک مسلمان علماء و محققین کی نگاہ سے اوجھل رہے ہیں۔ ذیل میں ایسے چند ایک علمی مراکز کا اجمالی تعارف ملاحظہ ہو۔

گہوارۂ تہذیب و تمدن مغربی افریقہ کا تصوّر کرتے ہی ہمارے ذہن میں جہالت اور تہذیبی پسماندگی

کی تصویر آجاتی ہے۔ یہ تصویر ہمارے دماغ میں استعمار نے پیدا کی ہے۔ مگر جب ہم مغربی افریقہ کی علمی اور ثقافتی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس واضح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ خطہ نہ صرف یہ کہ تہذیب و تمدن کی روشنی سے بہرہ ور تھا بلکہ خود تہذیب و تمدن اور علم و ثقافت کا علمبردار تھا علم و فن کو بڑی پذیرائی حاصل تھی۔ سر تھامس آرنلڈ کے بیان کے مطابق "مغربی افریقہ میں جو شخص تعلیم مکمل کر لیتا اور دعوت و تدریس کی مسند پر متمکن ہو جاتا اُسے قوم کے اندر بڑی عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ مغربی افریقہ کے بعض قبائل میں تو ہر بستی کے اندر علماء اور ادباء اور مرابطین کے استقبال کے لیے مخصوص مکانات بنے ہوتے تھے۔ جن ریاستوں میں قرآن کے احکام نافذ ہوتے تھے وہاں زندگی کے عام مسائل کے بارے میں ان معلّمین کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں تا کہ وہ قرآن کریم کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کریں۔ اس طبقے کا احترام اس درجہ تھا کہ یہ لوگ نہ صرف دوست ممالک میں بلا روک ٹوک گھوم پھر سکتے تھے بلکہ ایسے ممالک میں بھی انہیں نقل و حرکت کی پوری آزادی تھی جن سے جنگ ہوتی تھی۔"

مغربی افریقہ کے علماء قیروان (تونس)، طرابلس (لیبیا)، فاس (مراکش)، اور قاہرہ کے علمی گہواروں سے فیضیاب ہوتے تھے۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کی اکثریت دعوت و تبلیغ کے لیے وقف ہو جاتی تھی۔

مغربی مصنفین نے اگرچہ افریقہ کو گہوارہ جہل و تاریکی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کی یہ رائے سراسر مبالغہ پر مبنی ہے۔ افریقہ میں جوں جوں اسلام پھیلتا گیا علم و عرفان اور تہذیب و ثقافت کی شعاعیں اُسے منور کرتی گئیں۔ موسیٰ بن نُصیرؒ نے آغمات میں جو مساجد تعمیر کروائی تھیں وہ مراکش کے اہم علمی مراکز تھیں۔ اور اس کے بعد وہ سیاہ افریقہ میں تہذیب و معرفت کی روشنی پھیلانے کا مرکز بن گئیں۔ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں جب فاس شہر کی بنا ڈالی گئی تو اس سے مراکش اور مغربی افریقہ میں تہذیب و علم کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔ یہ شہر ہر سمت کے اہل علم و فکر کا ملجا بن گیا۔ فاس کے مدرسے قیروان اور اندلس کی علمی تحریک سے متاثر تھے اور اس تحریک کو وہ

افریقہ کے دُور دراز علاقوں میں منتقل کرتے رہے۔ اس کے بعد خود مغربی افریقہ میں ایسے علمی مراکز وجود میں آگئے جنہوں نے سیاہ براعظم کی ثقافتی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے۔ اوڈ گشت، جنی، ٹمبکٹو اور کانو وغیرہ ایسے مراکز کا گہوارہ رہے ہیں۔

اُوڈُگشت یہ سیاہ افریقہ کے مغرب میں اسلامی تہذیب کا اہم مرکز شمار ہوتا تھا۔ مشہور اندلسی جغرافیہ دان ابوعبید البکری کے بیان کے مطابق[1] یہ شہر خطِ استوا کے شمال میں ۱۸ عرض البلد اور ۱۹ طول البلد کے درمیان واقع تھا۔ سجلماسہ (موجودہ تافیلات) سے ۲۱ دن کی مسافت پر اور گھانا سے ۱۵ دن کے فاصلہ پر تھا۔ تکلہ کے جنوب میں تھا، جو موریطانیہ کا نوجی مقام ہے۔ اودگشت قدیم زمانے میں بلاد صنہاجہ کی تجارتی منڈی تھا۔ دسویں صدی عیسوی میں جب صنہاجہ نے گھانا کے اکثر حصوں کو فتح کر لیا تو اودگشت صنہاجی حکمرانوں کا پایۂ تخت بن گیا۔ ۹۶۱ء سے ۹۷۱ء تک اس شہر کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ اس کا حاکم ایک صنہاجی امیر تھا جس کا نام "تین بروتن" تھا اور سیاہ افریقہ (سوڈان۔ نائیجر یا نیجر وغیرہ) کے بیس بادشاہ اُس کے تابع تھے۔ ۴۵۰ھ میں دولتِ مُرابطین کے بانی عبداللہ بن یسین نے اس شہر کو فتح کیا جس سے بت پرست صنہاجیوں کی شوکت کا خاتمہ ہوگیا اور شہر پر اسلام کی عملداری شروع ہوگئی۔

جغرافیہ دان ابوعبید البکری (متوفی ۱۰۹۴ء) کے عہد میں یہ شہر ترقی و عروج کے بام پر تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اُس کی آبادی مراکش کے عربوں اور ان کے افریقی حلفاء اور بربر اقوام (بربر کتامیہ، لواتہ، زناتہ، نفوسہ، نفزاوہ) پر مشتمل تھی۔ اودگشت کے چاروں طرف باغات اور نخلستان تھے جگہ جگہ عظیم الشان مسجدیں اور پُر رونق مدرسے تھے۔ پُورا شہر خوبصورت اور بلند و بالا عمارات کی جلوہ گاہ تھا۔ رہائش گاہیں بڑی دلکش اور نظر فریب تھیں۔ بازار آباد اور پُر رونق تھے۔ تجارتی کاروبار خوب ترقی پر تھا۔ اسلامی ممالک کے گوشے گوشے سے اناج اور پھل پہنچ رہے تھے۔ کہربا (ایک خاص قسم کے گوند) کی بڑی مانگ تھی جو بحر اطلانتک سے لایا جاتا تھا۔ اودگشت کی صنعتی سرگرمیاں بھی

---

[1] المسالک والممالک ص ۳۴۹ اور اس سے آگے۔

عروج پر تھیں۔ نہایت اعلیٰ اور نفیس معدنی مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔ ریشمی کپڑا جس پر سونے کے تاروں کا نہایت عمدہ کام ہوتا تھا، کثرت سے تیار ہوتا تھا اور سونے کی شکل میں اس کی قیمت ادا کی جاتی تھی[1]۔"

جنّی یا دینیہ | دریائے نیجر کے بالائی حصّے پر دو ایسے شہر تاریخ نے تعمیر کیے ہیں جنہوں نے بعد کی صدیوں میں مغربی افریقہ اور مغربی سوڈان میں اسلام کی ترقی اور عظمت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک جنّی جو اہم تجارتی مرکز تھا اور دوسرا ٹمبکٹو۔

جنّی کی ۱۱۰۱ء میں تاسیس ہوئی۔ اس وقت مراکش پر مُرابطین کی حکومت قائم تھی۔ جنّی کا بادشاہ کمبرو (KUMBRU) ۱۲۰۰ء میں جب مسلمان ہوا تو پورا شہر اسلام کے نغموں سے گونج اٹھا اور عوام جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ کمبرو نے جب اسلام قبول کرنے کا ارادہ کیا تو اُس نے اپنی مملکت کے تمام اصحابِ علم اور اربابِ فقہ کو جمع کیا۔ مشہور مؤرخ عبدالرحمٰن السعدی کے بیان کے مطابق ان کی تعداد چار ہزار ۲ سو تھی۔ بادشاہ نے قبولِ اسلام کا اعلان کرنے کے بعد علماء سے درخواست کی کہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے شہر کا حامی و ناصر ہو[2]۔ اس کے بعد بادشاہ نے اپنا محل منہدم کرا دیا اور دین کی عظمت و محبت کی بنا پر وہاں عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی[3]۔ سرتھامس آرنلڈ کے قول کے مطابق اسلام نے بادشاہ کمبرو کے ماتحت شہروں میں حیرت انگیز ترقی کی۔ ابن بطوطہ نے چودھویں صدی عیسوی میں جنّی کا سفر کیا۔ چنانچہ یہ عالمی سیّاح نیگرو قوم کی دینی غیرت و حمیت، عبادت گزاری اور قرآن خوانی کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جمعہ کی نماز میں اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ اگر انسان قبل از وقت مسجد میں اپنی جگہ نہ بنا لے تو پھر اُسے نماز کے لیے جگہ نہیں ملتی[4]۔

ٹمبکٹو | ٹمبکٹو جنّی کا ہم عصر شہر ہے۔ اس کی ۱۱۰۰ء میں تاسیس ہوئی۔ اور بروایت عبدالرحمٰن السعدی ٹمبکٹو نہ صرف تجارتی میدان میں شہرت کے آسمان کو چھوتا تھا بلکہ یہ روزِ اوّل سے خالص اسلامی شہر

---

[1] المسالک و الممالک ص ۳۴۹ اور اس سے آگے۔ [2] تاریخ السودان للسعدی ص ۱۲-۱۳

[3] الدعوۃ الی الاسلام، سرتھامس آرنلڈ ص ۲۶۹-۲۷۰ [4] ابن بطوطہ ج ۴ ص ۴۲۱-۴۲۲

ہونے کا امتیاز بھی رکھتا تھا۔ نہ پرستشِ اصنام نے اسے ملوث کیا، اور نہ اس کی زمین پر ما سوائے رحمان کے کسی کو سجدہ کیا گیا[1]۔ اسلامی تعلیم اور روحانی تربیت کا مرکز ہونے کے اعتبار سے ٹمبکٹو کو زبردست اہمیت حاصل ہوگئی۔ حکمرانوں اور اصحابِ ثروت کی دلچسپی اور سرپرستی کی وجہ سے جویانِ علم اور نامور فقہاء کی جماعتیں ٹمبکٹو میں جمع ہونی شروع ہوگئیں۔ ٹمبکٹو میں اسلامی اور طبیعاتی علوم کی بہت بڑی درسگاہ تھی جس سے جلیل القدر علماء اور مورخین نے کسبِ فیض کیا اور پھر افریقہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا جھنڈا بلند کیا۔ مثلاً احمد بابا ٹمبکٹی، نیل الابتہاج کے مؤلف (جو ابن فرحون مالکی کی کتاب الدیباج المُذہّب کا تکملہ سمجھی جاتی ہے) اس مدرسے کے نامور فرزند ہیں۔ احمد بابا ٹمبکٹی نے علمائے مالکیہ پر بھی ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے اپنے اور اپنے شیخ ابن فرحون کے درمیانی رجال کی تاریخ بیان کی ہے[2]۔

ٹمبکٹو بڑی کامیاب تجارتی منڈی تھی۔ تاجروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ سیاحوں کی جماعتیں وارد ہوتی رہتی تھیں۔ مراکش کے ساحل اور طرابلس سے تجارتی قافلے آتے تھے۔ مصر، غدامس، فاس اور سوس وغیرہ کی تجارتی منڈیوں سے اس کا ربط تھا۔ ٹمبکٹو کی عمارات بڑی عالیشان اور خوبصورت تھیں۔ جن کے اردگرد اونچی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ حسن بن محمد الوزان نے جو "لیو افریقی" (LEO AFRICANIS) کے نام سے مشہور تھے، لکھا ہے:

> "ٹمبکٹو تاجروں اور صنعت کاروں کی دکانوں سے بھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر سوتی کپڑے اور یورپی کپڑے کے انباروں سے اسٹور اٹے ہوئے ہیں، جسے مراکشی سوداگر یہاں لا کر فروخت کرتے ہیں۔ شہر میں ایک عظیم الشان مسجد ہے جو پتھر سے بنائی گئی ہے اور جسے غرناطہ کے انجینئر اسحاق الساحلی نے تعمیر کیا ہے۔ اسی انجینئر نے بادشاہ کا محل بھی تعمیر کیا ہے جو فنِ تعمیر کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ سرکاری خزانہ دولت اور سونے کی سلاخوں سے بھرپور ہے۔ ایک ایک سلاخ کا وزن ۴۴ کیلو گرام ہے۔ سونے، مور چھل اور ہاتھی کے دانت

[1] تاریخ السودان ص ۲۱ - [2] جب مراکشی فوج نے ٹمبکٹو پر چڑھائی کی تو وہ احمد بابا کو گرفتار کر کے مراکش لے (۵)

کی تجارت میں ٹمبکٹو کو خاص شہرت حاصل ہے۔"

"ٹمبکٹو کی عورتیں چہروں پر نقاب ڈالتی ہیں۔ البتہ کنیزیں جو ہر قسم کی کھانے کی اشیاء فروخت کرتی ہیں چہرہ ننگا رکھتی ہیں۔ ٹمبکٹو کے باشندوں نے دولت سے بہرہ وافر پایا ہے۔ ٹمبکٹو کے گورنر عمر بن محمد الندی نے، جو سنگھائی کے بادشاہ کی طرف سے یہاں مقرر کیا گیا ہے اپنی دو بیٹیاں ٹمبکٹو کے دو تاجروں سے بیاہی ہیں۔ یہ دونوں تاجر سگے بھائی ہیں اور بڑے مالدار ہیں۔ ٹمبکٹو میں میٹھے پانی کے کنوؤں کی بہتات ہے۔ دریائے نیجر سے نکلی ہوئی نہریں اور نالیاں بھی ٹمبکٹو کو سیراب کرتی ہیں۔ اناج اور مواشی کی کثرت ہے۔ شہر میں تازہ دودھ اور مکھن کی بھاری مقدار صرف ہوتی ہے۔ البتہ نمک بہت گراں ہے اور کمیاب۔ کیونکہ یہ ٹمبکٹو سے ۵ سو میل کے فاصلہ پر تغزہ نامی جگہ سے آتا ہے۔"

"بادشاہ نے یہودیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے، کیونکہ وہ حالات کو خراب کرتے ہیں۔ ملک میں ایک بھی یہودی نہیں رہا۔ ایک مرتبہ اُسے یہ شکایت پہنچی کہ ایک مسلمان تاجر کے تعلقات کسی یہودی کے ساتھ ہیں، بادشاہ نے اس تاجر کی جائداد ضبط کر لی۔"

"ٹمبکٹو میں اربابِ قضا، اطبا اور مبلغین کی کثیر تعداد رہتی ہے۔ یہ لوگ باقاعدہ سرکاری فرمان کے ذریعہ مقرر کیے جاتے ہیں۔ بادشاہ علماء اور ادباء کا بہت احترام کرتا ہے۔ اُسے مخطوطات خریدنے کا بڑا شوق ہے خواہ کسی قیمت پر خریدنے پڑیں۔ یہ چیز اُس کی علم دوستی اور ادب نوازی کی دلیل ہے۔"

ٹمبکٹو پر ۱۳۳۶ء سے ۱۴۳۳ء تک مالی مملکت کی حکومت رہی۔ پھر صحرائی بربر قابض ہوئے اور چالیس سال رہے۔ ان کے بعد سنی سلاطین نے حکومت کی۔ ۱۵۰۰ء تک یہ شہر مراکشی فرمانرواؤں

---

۰ گئی۔ جہاں موصوف ۱۵۹۰ء تک رہے اور پھر واپس ٹمبکٹو آگئے۔ ۱۶۲۶ء میں ان کا ٹمبکٹو میں انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مادہ ٹمبکٹو۔ ترتیب: GARRA DE VAUX

کے زیر اقتدار تھا ۔ ۱۸۲۷ء میں سوڈان کے غُلبہ قبیلہ نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ اور فرانسیسیوں کے استیلاء تک ان کا قبضہ رہا ۔ ۱۸۹۳ء سے یہ خالص اسلامی شہر فرانسیسی مقبوضات میں شمار ہونے لگا اور اس کی ساری عظمت خاک میں مل گئی ۔ یورپی اقوام نے سب سے پہلے پندرھویں صدی میں ٹمبکٹو سے رابطہ قائم کیا تھا ۔ اٹلی اور فلورنس کے ساتھ تونس اور طرابلس کے راستے سے ٹمبکٹو کے تعلقات تھے ۔ یہاں سے چار بڑی شاہراہیں نکلتی ہیں ۔ ایک مصر کی طرف جو کانم اور گو اسے گزرتی تھی ۔ دوسری تونس کی طرف جو ہجار سے گزرتی تھی ۔ تیسری مراکش کی طرف جو سجلماسہ تافیلات اور توورت سے گزرتی تھی ۔ اور چوتھی سوڈان کی جانب ، جو مالی سے گزرتی تھی ۔ سولھویں صدی کے بعد ٹمبکٹو سے یورپ کے تعلقات ختم ہو گئے ۔ اور بالآخر فرانس نے اس پر قبضہ کر کے " تعلقات " کو بحال کیا ۔ پرانا شہر بھی موجودہ شہر کے جنوب میں دس میل کے فاصلے پر کھنڈرات کے اندر مدفون ہے ۔ دریائے نیجر اب اُسے سیراب نہیں کرتا ۔ البتہ نمک لانے والے قافلے اب بھی رواں دواں ہیں ۔

کانو مغربی افریقہ کے اسلامی مراکز میں سے ایک کانو ہے جو شمالی نائیجیریا کا اہم شہر ہے ۔ یہاں ہوسا قبائل آباد چلے آرہے ہیں ۔ ان قبائل کی سات مملکتیں تھیں ، کانو ، رانو ، زاریا ، دورا ، گوبیر ، کٹسینا ، زمفارا ۔ یہ مملکتیں مدتوں قائم رہیں ۔ ان کے دوام کا سبب یہ تھا کہ ہوسا قوم فطرتاً تجارت پسند ہے اور جنگ و جدال سے پرہیز کرتی ہے ۔ ہوسا زبان آج تک پورے مغربی افریقہ میں رائج ہے ۔ بلکہ ہماری اُردو کی طرح یہ وہاں کی " لنگوا فرانکا " ہے ۔ فرانسس مور نے ۱۷۳۱ء میں ہوسا قبائل کے مساکن دیکھے ہیں اور لکھا ہے :

" یہ قبائل دریائے گمبیا کے کنارے بستے ہیں ، عربوں سے ملتے جلتے ہیں ۔ اکثریت عربی بولتی ہے ۔ عربی ان کے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے ۔ ان کی عوامی زبان کو " فولی " کہا جاتا ہے ۔ یہ لوگ گندم اور روئی کاشت کرتے ہیں ۔ یہ دونوں جنسیں ضرورت سے زائد پیدا ہوتی ہیں ۔ یہ لوگ انہیں مناسب نرخوں پر فروخت کرتے ہیں ۔ سخاوت اور داد و دہش میں مشہور ہیں ۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتے کہ ان کے قبیلہ کا کوئی شخص

غلام بنا لیا گیا ہے تو اُسے مل جُل کر آزاد کروا لیتے ہیں"۔

لیو افریقی نے لکھا ہے :

"کانو دریائے نیجر سے ۵۰۰ میل دُور ہے۔ کانو میں زیادہ تر صنعت پیشہ لوگ بستے ہیں۔ یہ لوگ بڑے ترقی یافتہ ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں تاجروں کی بھی بھاری اکثریت ہے اور وہ بڑے غنی ہیں۔ ماضی میں کانو ایک عظیم ریاست سے عبارت تھا۔ یہاں کے باشندوں کا مشغلہ کاشت کاری کے جانوروں اور گائے کی پرورش اور کھیتی باڑی تھا۔ کانو میں اسلامی علوم کی تدریس کے اَن گنت مدرسے ہیں جن میں حفاظ اور عربی دان مدرسین پڑھاتے ہیں۔ شمالی نائیجیریا کے ہر شہر میں کئی مدرسے ہیں جو فقہاء کی نگرانی میں چلتے ہیں۔ فقہاء کو یہاں مالم (معلّم کا محرّف) کہا جاتا ہے۔ بچوں کو اوائل عمر میں مدرسہ میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اور بسا اوقات انہیں مزید تعلیم کے لیے دُور دراز شہروں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ کانو کے معلمین تنخواہ خوری کے بجائے تجارت کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی تعلیم خالص اسلامی جذبے پر مبنی ہے۔ یہاں ایسے مدرسے بھی ہیں جن کے اوقات تعلیم سورج نکلنے سے پہلے ایک گھنٹہ اور سورج غروب ہونے کے بعد ایک گھنٹہ ہوتے ہیں، تاکہ جو بچے یہاں پڑھیں وہ دن کو کام کاج میں والدین کا ہاتھ بٹائیں۔ مدارس کا نصاب تعلیم ایک ہی ہے۔ فرائض (احکام وراثت) کی تعلیم اور قرآن کے حفظ و ناظرہ کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ قرآن کی تفسیر بھی پڑھائی جاتی ہے۔ عربی زبان میں بھی اور مقامی زبان میں بھی۔ اونچی جماعتوں کے طلبہ حدیث، فقہ اور توحید کی کتابیں پڑھتے ہیں"۔

ہم عصر اہلِ علم و فضل کے ساتھ سلطان کانو کے تعلقات تھے۔ صاحب البُستان نے علماءِ تلمسان کے ذکر میں لکھا ہے کہ سلطان کانو نے نویں صدی ہجری کے مشہور عالم شیخ محمد بن عبدالکریم المغیلی کے نام ایک خط لکھا جس میں شیخ موصوف سے یہ دریافت کیا کہ حاکم وقت لوگوں کو حرام

کاموں سے باز رکھنے کے لیے کس حد تک اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے اور وہ حرام کام کیا ہیں جن کے ارتکاب پر نکیر ہونی چاہیے ۔ اس کے جواب میں شیخ المغیلی نے طویل خط لکھا جس میں تمام دینی واجتماعی اور سیاسی منکرات کی تفصیل بیان کی گئی اور بتایا گیا کہ حاکم کو ان کی بیخ کنی کے لیے کیا اقدامات کرنے چاہییں ۔ نویں صدی ہجری کے مجدد حافظ سیوطی نے بھی شمالی نائیجیریا کا سفر کیا ہے اور وہاں ایک مدت تک قیام کیا ہے ۔ حافظ سیوطی نے سلطان تکرور کو آداب جہانبانی کے موضوع پر مفصل خط تحریر کیا تھا ۔ حسن المحاضرۃ میں حافظ سیوطی نے اپنے سفر تکرور (نائیجیریا) کا ذکر کیا ہے ۔

شمالی نائیجیریا کے دوسرے شہر زاریا (ZARIA) اور کٹسینا (KATSENA) بھی علم و دانش کے مرکز تھے ۔ زاریا میں قضاۃ کی تعلیم و تربیت کے کئی ادارے تھے ۔ اناج اور پھلوں کی کاشت بڑی ترقی پر تھی ۔ اسی طرح کٹسینا جو کانو کے شمال مشرق میں کانو سے ۱۶۰ میل کے فاصلہ پر تھا ، خالص اسلامی شہر تھا ۔ وہاں کی صنعت و حرفت اور تعلیم و معاشرت ہر چیز اسلامی نظریہ کی عکاس تھی ۔

ے مشہور نائیجیری عالم آدم عبداللہ الدری نے اپنی کتاب "الاسلام فی نائیجیریا" میں اس خط کا پورا متن نقل کیا ہے

اَلاِخوانُ المسلمُون

تاریخ ــــ دعوت ــــ خدمات

ـــــ (خلیل حامدی) ـــــ

قیامِ تحریک سے پہلے کے حالات پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ کے ساتھ ہی مصر شدید سیاسی جھٹکوں سے دوچار ہوا۔ ملک کے اندر بوقلموں ملکی اور ملّی مسائل نے سر اٹھا لیا۔ تورانی قومیّت کے علمبردار ترکوں نے جب خلافت کی تنسیخ کا اعلان کیا تو اس کے ردِّ عمل میں عربوں کے اندر قومیّت اور وطنیت کے رجحانات اُبھر آئے۔ اپنی تاریخ، سیاسی حیثیت اور ازہر کے بین الملّی مقام اور بعض دوسرے اسباب کی بدولت مصر کو عرب دنیا کی قیادت حاصل رہی ہے، اس لیے مصر میں قومیّت اور وطنیت کے نعرہ نے جب جنم لیا تو آناً فاناً تمام عرب ملکوں میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی۔ مختلف وطنی تحریکوں نے پر پُرزے نکالے۔ سعد زغلول (متوفی ۱۹۲۷ء) کے نعرۂ "الدین للّٰہ والوطن للجمیع" کو فروغ ہوا۔ مصطفیٰ نحاس پاشا (متوفی ۱۹۶۴ء) کی قیادت میں وفد پارٹی کو عروج حاصل ہوا۔ وطنی تحریک نے وطن پرستی کی آڑ میں اور ترکوں کی تنسیخِ خلافت کو بہانہ بنا کر الحاد، زندقہ، آوارہ خیالی اور مغرب پرستی کو ہوا دی۔ نتیجۃً اسلام اور تجدّد (یا صحیح لفظوں میں مغرب پرستی) کی طویل اور دُور رس نتائج کی حامل کشمکش کا آغاز ہوا۔ تجدّد پرستوں کا محاذ مضبوط تھا کیونکہ حکومت اور پریس کی طاقت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے مقابلے میں اسلامی روایات کے علمبردار نہ صرف کمزور تھے بلکہ جو تھے وہ بھی خود اعتمادی سے محروم تھے۔ مزید برآں سیاسی پارٹیوں کی باہمی آویزش نے بھی ملک کی فضا کو مکدّر کر رکھا تھا۔ وفد پارٹی برسرِ اقتدار آتی تو دستور پارٹی کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگ جاتی اور دستور پارٹی کی حکومت بنتی تو وہ وفد سے ملک کی تطہیر کو موضوع بنا لیتی۔

اسی زمانے میں علی عبدالرزاق کی رسوائے زمانہ کتاب الاسلام واصول الحکم (اسلام اور اصول حکمرانی) شائع ہوئی۔ اس کتاب کا مرکزی موضوع ہے " دین کا سیاست اور ریاستی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے" اور" خلافت کے ادارہ کو سیاسی اختیارات دینے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں" طٰہٰ حسین کی کتاب فی الشعر الجاھلی بھی اسی دورِ کشمکش کی پیداوار ہے جس میں خود قرآن کے بیانات کے بارے میں شکوک وشبہات اٹھائے گئے ہیں۔ قاسم امین کی کتاب تحریر المرأۃ میں عورتوں کے لیے ان آزادیوں کا مطالبہ کیا گیا ہے جو مغرب میں عورت کو حاصل ہیں۔ المجمع الفکری کا قیام عمل میں آیا، تاکہ فکر ونظر کی آزادی کے نام سے اسلام بلکہ تمام ادیان پر حملے کیے جا سکیں۔ ہفت روزہ السیاستہ تجدد پسندوں کا آرگن تھا اور لاگ لپیٹ کے بغیر تجدد، فرعونی تہذیب کے احیاء اور مغرب سے وابستگی کی دعوت دیتا تھا۔ دستور پارٹی کے بااثر لیڈر عدلی یکن، عبدالخالق ثروت، اسماعیل صدقی محمد محمود اور لطفی السید اس کے سرپرست تھے اور اسلام پر اس کے حملوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے امین رافعی کا الاخبار اسلامی مطالبات کی تائید کرتا رہا، مگر اپنے مجاہد ایڈیٹر کی وفات (۱۹۲۶ء) کے بعد یہ بھی ابدی نیند سو گیا۔ اب میدانِ صحافت میں صرف محب الدین الخطیب کا ہفت روزہ الفتح رہ گیا تھا مگر نقار خانے میں اس طوطی کی آواز کسے سنائی دیتی۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا دین کا محاذ کمزور اور منفی نوعیت کا تھا۔ سید جمال الدین افغانی (م ۱۸۹۷ء) کے بعد محمد عبدہٗ نے ان کے مشن کو سنبھالا۔ مگر شیخ محمد عبدہٗ سیاست کے میدان میں بالکل ناکام رہے۔ ویسے بھی اپنے استاذ سید جمال الدین افغانی کے برعکس وہ یورپ سے مرعوب تھے۔ ان کے شاگردوں میں سید رشید رضا (م ۱۹۳۵ء) کے سوا کوئی مرد مجاہد نہ نکلا۔ رشید رضا کا دائرہ عمل گو کہ محدود تھا اور وہ ترکوں اور عربوں کی کشمکش میں عرب قوم پرستوں کے ہم نوا تھے، مگر ان کے بعد تو رہی سہی آواز بھی دب گئی۔ اور مصطفیٰ صادق رافعی کو چھوڑ کر اس طوفانِ اباحیت وآوارگی کا خود اعتمادی سے مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔

حالات اس درجہ بدتر ہو گئے کہ نہ صرف مصر میں بلکہ اکثر عرب ملکوں میں فرعونیت ونمرودیت کا

کلمہ پڑھا جانے لگا۔ خاندانِ نبوت کے گل سرسبد امیر فیصل بن حسین نے کہا "ان العرب کانوا عربًا قبل محمد و موسیٰ" (عرب محمد اور موسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام سے پہلے بھی عرب تھے)۔ دمشق یونیورسٹی میں علانیہ خدا کا جنازہ نکالا گیا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کھلم کھلا اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانِ طعن دراز کی جانے لگی۔ سیاسی مجلسوں میں اسلام کا نام لینا نکو بن جانے کے مترادف بن گیا۔ پارکوں اور باغوں میں اچھے خاصے مسلمان نماز پڑھتے ہوئے شرمانے لگے۔ یہاں تک نوبت پہنچ جانے کے بعد غیرتِ حق کو جنبش ہوئی اور اسماعیلیہ کے ایک نوجوان سے مشیتِ ایزدی نے وہ کام کرایا جو بڑے بڑے علماء و مشائخ سے بھی نہ ہو سکا۔

حسن البنا: شخصیت و حالات | ہمارا اشارہ اخوان المسلمون کے بانی امام حسن البنا کی طرف ہے۔ حسن البنا ۱۹۰۶ء میں اسماعیلیہ میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول خالص اسلامی تھا۔ ان کے والد شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا کا پیشہ اگرچہ گھڑی سازی تھا، مگر وہ خود بہت بڑے عالم تھے، فقہ و حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے، قرآن کے حافظ تھے[1]۔ عبدالرحمٰن البنا نے اپنے ہونہار صاحبزادے کو بچپن میں قرآن حفظ کروا دیا اور اُن کی توجہ دینی علوم کی طرف مبذول کرا دی۔ حسن البنا گھریلو تعلیم و تربیت کے ساتھ اسماعیلیہ کے مدرسۃ الرشاد الدینیہ میں داخل ہوئے۔ یہ مدرسہ اگرچہ حکومت کے زیر انتظام تھا مگر اس میں دینی تعلیم و تربیت پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ ۱۴ برس کی عمر (۱۹۲۰ء) میں دمنہور

[1] شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا نے متعدد کتبِ حدیث کی شرحیں لکھی ہیں اور پرانی کتابوں کو نئے سرے سے مدوّن کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی مُسند کو فقہی ابواب کے تحت مرتب کیا ہے، ہر حدیث کی تخریج کی ہے، رجال و سند پر کلام کیا ہے اور احادیث پر تشریحی حواشی لکھے ہیں۔ کتاب کا نام ہے "الفتح الربانی فی ترتیب مسند الامام احمد الشیبانی"۔ اور شرح کا نام ہے: "بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی"۔ اسی طرح ابو داؤد الطیالسی کی مُسند کی "منحۃ المعبود" کے نام سے تبویب و تشریح کی ہے۔ امام شافعی کی مسند اور سنن کو "بدائع المُسند" کے نام سے نئے سرے سے جمع و ترتیب سے آراستہ کیا ہے۔ ایک اکیڈمی کا کام عبدالرحمٰن البنا کی تنہا ذات نے انجام دیا ہے۔ ان کی وفات ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔

کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں داخل ہوگئے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے برعکس مذہبی فرائض کے سخت پابند رہے۔ اس کے بعد انہیں ایک تعلیمی ادارے میں معلّمی کے فرائض سونپے گئے لیکن انہوں نے تعلیم کی تکمیل کے لیے قاہرہ کا رخ کیا، اور دارالعلوم (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لے لیا۔ دارالعلوم اُس زمانے میں چھوٹا ازہر کہلاتا تھا۔ جدید علوم مثلاً تربیت، علم النفس، فلسفہ، منطق، سیاسیات، اجتماع اور ریاضی کے ساتھ ساتھ لسانیات پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ طریقۂ تدریس جدید طرز کے مطابق تھا۔ ۱۹۲۷ء میں حسن البنّا نے دارالعلوم سے گریجویشن کی۔ اس امتحان میں اپنے ساتھیوں میں اوّل آئے اور پورے مصر کے اندر انہوں نے پانچویں پوزیشن حاصل کی۔ فراغت کے بعد انہیں وزارتِ تعلیم کی طرف سے اسماعیلیہ کے مدرسہ امیریہ (گورنمنٹ اسکول) میں مدرس مقرر کیا گیا اور وہ اسماعیلیہ چلے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال تھی۔ ۱۹۳۳ء میں انہیں اسماعیلیہ سے قاہرہ تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے وہ قاہرہ ہی میں رہے۔ ۱۹۴۶ء میں وزارتِ تعلیم کی ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور یکسوئی کے ساتھ دعوت کی توسیع و تنظیم میں لگ گئے۔

حسن البنا معلّم سے زیادہ داعی تھے۔ مشیتِ ایزدی اُن سے جو کام لینا چاہتی تھی گھر کا ماحول اور تعلیم اُن کو اسی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ ازہر کی تعلیم کے بجائے دارالعلوم کا تعلیمی نظام ان کے داعیانہ پہلو کو اجاگر کرنے میں خاص طور پر ممد اور مفید ثابت ہوا۔ ماحول کا بگاڑ، طوفانِ الحاد و دہریت، اور ازہری مصلحین کی نارسا مساعی اُن کے اندر اضطراب و قلق کے سمندر متلاطم کر رہی تھیں۔ قدرت نے انہیں بڑی ہی باوقار اور مرعوب کن شخصیت عطا کی تھی۔ جسے خرابی حالات نے سیماب وش بنا دیا تھا۔ انہیں صحت مند سیاسی اور اجتماعی شعور سے نہ صرف بہرۂ وافر ملا تھا بلکہ داعی کی جملہ خصوصیات اور صلاحیتیں موجود تھیں۔ چنانچہ وہ تنہا اُٹھے مگر ایک اُمّت کی قوت بن کر۔ اسلام کے خزاں رسیدہ گلستان کو مدتِ قلیل میں ہرا بھرا کر دیا۔ پانی سے سیراب کرنے کے بجائے خون سے سیراب کرنے کی سنت کو زندہ کیا۔ اور عاشقانِ پاک طینت کی ایک ایسی جماعت کھڑی کر دی جو ان کی تجویز کردہ "راہِ جنون" پر پوری شانِ جذب و وارفتگی کے ساتھ گامزن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حسن البناؔ کو دعوت واصلاح اور جہادِ نصیحت کا جو جذبہ ودیعت کیا تھا وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں ظہور پذیر ہوتا رہا۔" الاخوان المسلمون" (مسلمان بھائی) کے نام سے باقاعدہ ایک جماعت کی تشکیل مارچ ۱۹۲۸ء کو اسماعیلیہ میں ہوئی مگر اس تشکیل سے قبل حسن البناؔ کی زندگی بتا رہی تھی کہ یہ شخصیت نہ صرف مصر بلکہ پورے عالمِ عرب پر اثر انداز ہونے والی ہے۔

دعوتِ اسلامی سے ان کی لگن حسن البناؔ جس زمانہ میں مدرستہ الرشاد الدینیہ کے معصوم طالب علم تھے۔ ان کا گزر ایک دن محمودیہ کی ندی پر ہوا۔ کنارے کے پاس ایک بادبانی کشتی کھڑی دیکھی جس پر لکڑی کی ایک عُریاں مورتی آویزاں تھی۔ حسن البناؔ اس منظر کو دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے۔ فوراً مقامی پولیس چوکی میں گئے اور پولیس افسر کے سامنے اس مورتی کے خلاف احتجاج کیا۔ پولیس افسر معصوم طالب علم کی غیرت ایمانی سے متاثر ہو کر فوراً ملاح کے پاس گیا اور مورتی کو مستول سے اُتروا دیا۔

اسی زمانے میں مدرستہ الرشاد الدینیہ میں طلبہ نے "جمعیت اخلاق ادبیہ" کے نام سے ایک بزم قائم کی اور اس کے صدر حسن البنا منتخب ہوئے۔ مگر نوخیز داعی کی امنگیں بھلا یہ بزم کیا پوری کر سکتی تھی۔ اس نے مدرسہ کی حدود سے باہر ایک اور انجمن قائم کی جس کا نام تھا جمعیت منع المحرمات (انجمن انسدادِ محرمات)۔ یہ جمعیت لوگوں کو خطوط کے ذریعہ سے نیکی کی تلقین کرتی تھی۔ جس شخص کے بارے میں اس جمعیت کو یہ خبر ملتی کہ وہ محرمات کا ارتکاب کرتا ہے یا فرائض میں تساہل برتتا ہے، جمعیت کی طرف سے گمنام طریقے سے اُسے ایک خط ارسال کر دیا جاتا جس میں اُسے خدا و آخرت کا خوف دلایا جاتا۔

دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں جب حسن البنا پہنچے تو ان کا تعارف طریقۂ حصافیہ کے شیخ سے ہوا۔ طریقۂ حصافیہ کے پیرو عشاء کی نماز کے بعد ذکر اللہ کی مجلس منعقد کرتے تھے۔ حسن البناؔ ان روحانی مجلسوں سے متاثر ہوئے اور اس سے ان کے جذبۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مزید غذا ملی۔ قدرت نے یوں ان کے روحانی پہلو کی تربیت کا خاص انتظام فرما دیا۔ طریقۂ حصافیہ اگرچہ تصوف کا ایک سلسلہ تھا مگر حسن البناؔ نے اس طریقہ سے صرف قلبی غذا اخذ کی کیونکہ ان کی نگاہ میں

دعوت کو کسی خاص طریقہ میں محدود ہونے کے بجائے عام ہونا چاہیے اور علم اور تربیت اور جہاد پر مبنی ہونا چاہیے۔ اسی زمانے میں ایک اور صوفی تاجر سے ان کی راہ و رسم بڑھی۔ یہ تاجر اسکول کے لڑکوں کو ہفتہ عشرہ میں ایک مرتبہ قبور کی زیارت کے لیے لے جاتا اور وہاں انہیں صلحاء کی حکایات و احوال سناتا جن سے ان کے دل گداز اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور ان کے اندر خدا اور رسول کی اطاعت کا جوش و جذبہ امڈ آتا۔ حصافی اخوان سے بھی حسن البنّا کے روابط روز بروز مضبوط ہوتے گئے۔ حسن البنّا نے ان کو جمع کر کے ایک انجمن قائم کی جس کا نام تھا جمعیت حصافیہ خیریہ (حصافی بھائیوں کی رفاہی انجمن) حسن البنّا اس انجمن کے سکرٹری منتخب ہوئے۔ اس انجمن کے دو مقصد تھے۔ ایک اخلاق فاضلہ کی دعوت اور منکرات و محرمات کا سدباب، دوسرا عیسائی مشنریوں کا سدباب، جو علاج، خانہ داری کی تعلیم اور یتیم خانوں کی آڑ میں عیسائیت پھیلا رہے تھے۔ حسن البنّا کی عمر اس وقت ۱۴ سال تھی۔

قاہرہ میں ابتدائی کوششیں جب قاہرہ گئے اور دارالعلوم میں داخل ہوئے تو ایک طرف خارجی ماحول اور دوسری طرف داخلی احساسات نے انہیں بے چین کر دیا۔ "جمعیتِ مکارم اخلاق" میں رکن کی حیثیت سے شریک ہوئے جو اس وقت قاہرہ کے فساد زدہ ماحول میں واحد اصلاحی انجمن تھی۔ اس جمعیت کے درسوں میں وہ پابندی سے شریک ہوتے رہے لیکن قاہرہ بے راہ روی، فسادِ اخلاق اور مغربیت میں جس بُری طرح ڈوبا جا رہا تھا حسن البنّا کی نظر میں اس کا تدارک مسجد کے وعظوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے سوچا "جو لوگ مسجد میں نہیں آتے دراصل وہ وعظ و ارشاد کے زیادہ محتاج ہیں۔ ان میں دینی اور اخلاقی اصلاح کی فکر ہونی چاہیے۔" اس غرض کے لیے حسن البنّا نے دارالعلوم اور ازہر کے طلبہ پر مشتمل ایک گروہ تیار کیا اور انہیں قہوہ خانوں (جہاں سینکڑوں لوگ روزانہ شام کو تفریح کے لیے جمع ہوتے ہیں) اور پبلک اجتماعات میں درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کی طرف راغب کیا۔ یہ گروہ جس میں حسن البنّا خود بھی شامل تھے، قہوہ خانوں میں جا کر قرآن اور حدیث کے درس دیتا اور نرد بازی، قہوہ نوشی، شیشہ کشی، اور قصہ خوانی کے بجائے جمہور کو دین کے تقاضوں کی جانب متوجہ کرتا۔ اس طریقۂ وعظ پر مشائخ کی طرف سے بار بار انگشت نمائی کی گئی مگر یہ

کامیاب رہا اور شہروں سے گزر کر قصبوں اور دیہاتوں میں بھی اس کا تجربہ کیا گیا۔ اسی گروہ کے اندر سے ایک کمیٹی وجود میں آگئی جو دعوت اسلامی کی اشاعت کی نگراں قرار پائی۔ گرمائی تعطیلات میں یہ گروہ غیر معمولی طور پر سرگرم ہو جاتا اور شہر اور دیہات اس کی جولاں گاہ بن جاتے۔ حسن البنّا اور ان کے ساتھیوں کو اس طریقۂ دعوت سے دو چیزیں حاصل ہوئیں۔ خود اعتمادی اور عوامی خطابات کا کامیاب انداز۔

لیکن، کمالی انقلاب کے بعد مصر میں الحاد و اباحیت کی جو وبا پھوٹ پڑی تھی اور جس طرح ہر پیر و جوان اس کی لپیٹ میں آرہا تھا اس کے سامنے یہ محدود و ناتواں "واویلا" بے اثر تھا۔ حریت اور جمہوریت کی آڑ میں ایسے اخبارات و رسائل اور ایسا لٹریچر بازار میں آنے لگا جس کا مقصد دینی اثرات کو کمزور کرنا اور عوام کے دل سے دین کے احترام کو ختم کرنا تھا تاکہ "حریت پسندوں کے دعوے کے مطابق ملک حقیقی طور پر فکر اور عمل کی آزادی سے بہرہ ور ہو سکے"۔ حسن البنا کی نظر میں "حالات کسی بڑے اور ٹھوس کام کا تقاضا کر رہے تھے"۔ چنانچہ انہوں نے علماء اور مشائخ کو اس کام کی طرف توجہ دلانی شروع کی اور انہیں ایک جماعت کی شکل میں میدان میں اترنے پر آمادہ کیا۔ سید رشید رضا مرحوم مدیر مجلۃ المنار سے ملے۔ المکتبۃ السلفیہ کے مالک محب الدین الخطیب سے ربط قائم کیا۔ ازہر کے نامور عالم دین شیخ دجوی سے دردِ دل بیان کیا۔ شیخ محمد خضر حسین شیخ الازہر کے آگے حالات کی شکایت کی۔ فرید وجدی سے تبادلہ خیالات کیا۔ یہ حضرات اس وقت مصر کے چوٹی کے اہلِ علم تھے۔ حسن البنّا ایک ایک سے ملے اور انہیں اسلام کے لیے ٹھوس بنیادوں پر کام کرنے کی دعوت دی۔ ان کی اس تگ و تاز کے نتیجے میں ان حلقوں میں ہلچل پیدا ہو گئی اور پہلے ہفت روزہ الفتح کا اجراء ہوا اور پھر "جمعیت الشبان المسلمین" کی تاسیس ہوئی۔ الفتح نے محب الدین الخطیب کی زیر ادارت ملحدانہ افکار کے صنم کدے میں جہاد کا نعرہ بلند کیا اور جمعیت الشبان المسلمین نے ڈاکٹر عبدالحمید سعید کی قیادت میں نوجوان نسل کو بے راہ روی سے بچانے کا بیڑہ اٹھایا۔ حسن البنا جمعیت الشبان المسلمین میں شامل ہو گئے بلکہ بانیوں میں شمار ہوئے۔ اس وقت حسن البنا دار العلوم کے آخری سال کے طالب علم تھے۔ دار العلوم کی طرف سے انہیں تھیسس کا جو موضوع دیا گیا اس کا

عنوان تھا: "تعلیم کے بعد آپ کیا کام کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اس کے لیے کیا وسائل اختیار کریں گے۔" حسن البنا نے اس کے جواب میں لکھا: "میں داعی اور معلم بننا چاہتا ہوں، دن کو اور سال کے اکثر ایام میں مصر کی نئی نسل کو تعلیم دوں گا، اور راتوں کو اور چھٹیوں کے ایام میں اُن کے والدین کو دین کے مقصد سے آگاہ کروں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ سعادت کا سرچشمہ کہاں ہے، اور زندگی کی مسرتیں کیسے دستیاب ہوں گی۔ اس غرض کے لیے ہر وہ وسیلہ اختیار کروں گا جو میرے بس میں ہوگا۔ تقریر سے، گفتگو سے، تالیف و تصنیف سے، کوچہ گردی اور بادیہ پیمائی سے، الغرض ہر مؤثر ہتھیار سے مدد لوں گا۔" یہ ہیں اُس نوجوان کے جذبات، جو قعر دریا میں اُترا ہوا ہے اور پھر نہ صرف اپنے دامن کو تر ہونے سے بچانے کا عزم رکھتا ہے بلکہ دوسروں کے دامن کی بھی اُسے فکر ہے۔

اسماعیلیہ میں واپسی اور تاسیس جماعت ۱۹۲۷ء میں حسن البنا نے دارالعلوم کا ڈپلوما لیا اور اسماعیلیہ کے مدرسہ امیریہ میں مدرس مقرر کر دیے گئے۔ اسماعیلیہ انگریز کی چھاؤنی تھی۔ نہر سویز انگریز فوجوں کے قبضہ میں تھی۔ سویز کی کمپنی نے (جس پر انگریزوں اور فرانس کی اجارہ داری تھی) مصر کی اقتصادی شاہ رگ کو دبا رکھا تھا۔ مسلمان مذہبی گروہوں میں منقسم تھے۔ عوام الناس مذہبی جھگڑوں سے بیزار ہو کر مسجدوں کے بجائے قہوہ خانوں کا رُخ کر چکے تھے۔ حسن البنا نے اسماعیلیہ کے تین قہوہ خانوں کو منتخب کر لیا، تقریروں اور گفتگوؤں کے ذریعہ سے لوگوں کو جھنجھوڑا اور ان میں فریضۂ اقامتِ دین کا احساس پیدا کیا۔

مارچ ۱۹۲۸ء کو اسماعیلیہ کے معزز اور باشعور لوگوں کی ایک جماعت حسن البنا کے گھر پر جمع ہوئی۔ یہ جماعت چھ افراد پر مشتمل تھی جن کے نام یہ ہیں: حافظ عبدالحمید، احمد الحصری، فؤاد ابراہیم، عبدالرحمٰن حسب اللہ، اسماعیل عز، زکی المغربی۔ یہ لوگ کام کرنے کا عزم لے کر آئے تھے گفتگو اور تبادلۂ خیالات کے بعد انہوں نے حسن البنا کو کام کی نگرانی، قیادت اور رہنمائی کا فرض سونپا اور اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہر ممکن قربانی دینے کی بیعت ہوئی۔ اس مختصر سی تنظیم کا نام کیا ہو؟ ـــــ حسن البنا نے برجستہ کہا ہم سب الاخوان المسلمون (مسلمان بھائی) ہیں۔ یوں یکایک

یہ نام زبانوں پر آگیا اور اسی نام سے یہ جماعت متعارف ہوئی۔

تاسیسِ جماعت کے بعد حسن البنّا ۵ سال تک اسماعیلیہ میں رہے اور اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں ان کی تبدیلی قاہرہ میں ہوگئی۔ اسماعیلیہ کے ۵ سال یہ جماعت نہایت خاموشی کے ساتھ کام کرتی رہی۔ مسجد اس جماعت کا مرکز تھی اور "پوری زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ دو" اس جماعت کا مشن تھا۔

اسماعیلیہ کے علاوہ حسن البنا اور ان کے رفقاء نواحی آبادیوں میں بھی دعوت کی اشاعت کے لیے نکلتے۔ ہفتہ وار تعطیل میں اُن کا ہدف ملحقہ آبادیاں ہوتیں اور سالانہ تعطیلات میں دُور دراز مقامات۔ درس و تدریس اور وعظ و بحث اشاعتِ دعوت کے وسائل تھے۔ بعض مشایخ اور اہلِ کینہ نے حسن البنا کی تقریروں کو ہدفِ تنقید بنایا، مگر اس کے علی الرغم یہ خاموش سیلاب بہتا رہا۔ جماعت کے لوگ عوامی اجتماعات کی جگہوں میں درس دیتے۔ توحید و آخرت ان کا موضوع ہوتے۔ اختلافی مسائل سے پرہیز کرتے۔ عام ملکی حالات کا تجزیہ کیا جاتا۔ عوام کو داخلی اور خارجی خطرات کی جانب توجہ دلائی جاتی۔ ان کی دعوت سے متاثر ہونے والوں کی اکثریت محنت کاروں پر مشتمل تھی۔ حسن البنا کے الفاظ میں: "جماعت کے کارکنوں نے کوئی قصبہ اور بستی نہ چھوڑی جہاں وہ نہ پہنچے ہوں، مسجدوں میں، گھروں میں اور چوپالوں میں جا جا کر انہوں نے دعوت پھیلائی"۔ ان پانچ سالوں کی کارکردگی یہ ہے: دو سالوں کے اندر ابوصویر، پورٹ سعید اور بلاح کے مقامات پر شاخیں قائم ہوگئیں۔ تیسرے سال سویز میں بھی ایک مضبوط شاخ وجود میں آگئی۔ چوتھے سال دس شاخیں قائم ہوگئیں۔ اسماعیلیہ میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ کھولا گیا۔

امام حسن البنّا کے قاہرہ منتقل ہو جانے سے دعوت نئے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ اب تک تو یہ ایک ابتدائی کوشش تھی لیکن اس کے بعد یہ ایک ملک کی عظیم تنظیم کی حیثیت سے اُبھری۔ دوسرے لفظوں میں "الاخوان المسلمون" کا تعارف ایک جامع اور ہمہ گیر تحریک کی شکل میں قاہرہ سے ہوا۔ اب ہم اخوان المسلمون کا جائزہ لینے کے لیے اُسے چند عنوانات میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ طوالت سے دامن بچا کر اس تحریک کی دعوت اور اس کی خدمات اور اس کی سرگذشت سے اپنے

قارئین کو متعارف کرائیں۔ اگرچہ سچی بات یہ ہے کہ اتنی عظیم تحریک کو اتنے مختصر لفظوں میں پیش کرنا راقم السطور کے بس کی بات ہے اور نہ اس تحریک کے ساتھ انصاف۔ مختصر ترین لفظوں میں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف اتنا کہ ؎ سر داد و نداد دست بر دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

تحریکِ اخوان کے مراحل | پہلا مرحلہ: ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۹ء۔ اس مرحلہ میں یہ دعوت ایک ہمہ گیر نظریہ کے قالب میں اُبھری۔ دوسرا مرحلہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک۔ اس مرحلہ میں اس دعوت نے برملا سیاسی میدان میں قدم رکھا، ایک مضبوط قوت کی حیثیت سے یہ حکومت کی نگاہ میں کھٹکنے لگی، اور آزمائشوں کے بادل اس کے سر پر گرجنے لگے۔ تیسرا مرحلہ ۱۹۴۵ء سے جولائی ۱۹۵۴ء تک۔ اس مرحلہ میں ایک طرف اخوان کی تحریک مصر کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی اور دوسری طرف اس پر تشدد و جبر کے سخت وار ہوئے۔ اس مرحلہ میں امام حسن البنّا کی شہادت ہوئی۔ استاذ حسن الہضیبی تحریک کے مُرشدِ عام منتخب ہوئے۔ ملک کے اندر فوجی انقلاب برپا ہُوا۔ اور بالآخر انقلابی حکمرانوں کے ہاتھ اس جماعت کے خلافِ قانون قرار دینے اور اس کے رہنماؤں کو پھانسی کی سزائیں دینے پر یہ مرحلہ ختم ہُوا۔

پہلا مرحلہ ۱۹۲۸ء - ۱۹۳۹ء

خاموش کام | قاہرہ کے ابتدائی سالوں میں یہ دعوت حسبِ سابق خاموشی اور پردہ داری کے ساتھ جاری رہی۔ مسجدوں میں وعظ و تذکیر ہوتی۔ متأثرین اور حامیوں کو منظم کیا جاتا۔ شاخوں کی تاسیس ہوتی۔ قصبوں اور شہروں کے دورے ہوتے۔ ایک سال کے بعد (۱۹۳۴ء) میں امام حسن البنا نے ایک مضمون میں سالانہ کارکردگی کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھا: "اخوان کی دعوت اور نظریہ مصر کے ۵۰ سے زائد شہروں اور قصبوں تک پھیل گیا ہے۔ ان میں سے ہر جگہ کوئی نہ کوئی مفید اسکیم عمل میں آگئی ہے۔ مثلاً اسماعیلیہ میں اخوان نے ایک مسجد بنائی ہے، ایک کلب

بنایا ہے، بچوں کی تعلیم کے لیے حراء کے نام سے اور بچیوں کے لیے "امہات المومنین" کے نام سے مدرسے کھول دیئے ہیں۔ شبراخیت میں مسجد اور کلب، اور بچوں کا اسکول اور ایک دارالصناعت قائم ہو چکا ہے۔ جو بچے تعلیم مکمل نہیں کرسکتے وہ دارالصناعت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح محمودیہ میں کپڑے اور قالین بننے کی ایک فیکٹری انہوں نے کھول لی ہے۔ اور ساتھ ہی قرآن پاک کے حفظ وناظرہ کی تعلیم کی درسگاہ قائم کر دی ہے۔ دفہلیہ میں بھی حفظ وناظرہ کی تعلیم کا مدرسہ جاری ہو گیا ہے۔ الغرض ادفو سے لے کر اسکندریہ تک ہر شاخ نے کوئی نہ کوئی نفع بخش اسکیم جاری کر لی ہے۔"

تعلیمی خدمات اور حکومت سے اصلاح کا مطالبہ خود دعوت کے مزاج، اور اس پر ملک کے نو بہ نو مسائل نے تحریک کے دائرے کو وسیع کر دیا اور ثقافتی اور سیاسی امور بھی اُس کے منصوبے میں شامل ہو گئے۔ ثقافتی دائرے میں اخوان نے جو تعلیمی اور تربیتی اسکیمیں شروع کیں نہ صرف عوام کے اندر انہیں مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ حکومت بھی اُن سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وزیر اعظم محمد محمود پاشا نے اخوان کو ان علاقوں میں بھی مدارس کھولنے کا مشورہ دیا جہاں ان کے مدارس نہیں تھے۔ حسن البنّا نے اُسے ایک طویل خط میں توجہ دلائی:

"مصری معاشرے کے اندر اخلاقی اقدار فنا ہو رہی ہیں، اخلاقی فضائل ومحاسن افسوسناک حد تک پامال ہو چکے ہیں، ہر طرف سے ان کو تہ وبالا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، افراد اور خاندان، ابدان واجسام ہر ایک بربادی کا نشانہ بن چکا ہے اور فوری اصلاح کا محتاج ہے۔ اصلاح کے لیے بھی متعدد وسائل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ بنیادی وسائل یہ ہیں کہ تعلیم کے سرچشمہ کو درست کیا جائے، ملکی قانون میں مفید تبدیلیاں لائی جائیں، نوجوانوں کے فرصت کے اوقات کا بہتر مصرف پیدا کیا جائے اور منکرات کا سختی سے سدباب کیا جائے۔"

محمد محمود پاشا سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک جتنی وزارتیں ملک میں قائم ہوئیں،

امام حسن البنا نے ان کو جماعت کی طرف سے خطوط لکھے۔ان خطوط میں داخلی اصلاحات تجویز کی گئیں، اجتماعی اور اقتصادی اور ثقافتی پہلوؤں سے ملک کے حالات کو سدھارنے کا مشورہ دیا گیا اور اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔محمد محمود پاشا کو انہوں نے جو خط لکھا اس میں شرح و بسط سے مصری قوم کی حالت بیان کی اور مصر جس جہالت، غربت، بیماری، اخلاقی انحطاط اور تعلیمی پستی میں مبتلا تھا اُس کی جانب وزیر اعظم کو توجہ دلائی۔اس میں وہ لکھتے ہیں:

"ان سب امراض کا علاج کتاب اللہ کی تعلیمات ہیں۔ . . . اگر یہ عذر پیش کیا جائے کہ ملک کے اندر انگریز بیٹھا ہے، تو یہ بے بنیاد عذر ہے۔انگریز کو ہمارے داخلی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں۔اگر یہ دلیل دی جائے کہ یہاں لاکھوں غیر ملکی رہتے ہیں، تو یہ دلیل بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔ہم بات چیت سے ان کو سمجھا سکتے ہیں۔وہ خود دیکھ لیں گے کہ اسلام کے احکام اور تعلیمات کس طرح ان کے حقوق کی ضمانت دیتے ہیں اور اُن کے جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں۔یہی بات ہم غیر مسلموں سے کہیں گے۔انہیں ہماری تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ ہم نے کس طرح اُن سے عدل و انصاف برتا۔اصل روڑا خود مصری لیڈر ہیں۔وہ اسلام کی اصل دعوت و مزاج سے ناواقف ہیں۔ضرورت ہے کہ وہ خود عقیدۂ اسلام اور شریعتِ اسلامیہ کی طرف رجوع کریں۔ . . ۔مصر میں الحاد کی بیماری ترکی سے آئی ہے۔اس لیے ہم محمد محمود پاشا کی حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں کلمۂ اسلام کو بلند کرے اور اُسے اپنا شعار بنائے"۔

مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو دعوت | اخوان المسلمین کا وہ خط سب سے اہم ہے جو انہوں نے ۱۹۳۶ء میں شاہ مصر فاروق، مصر کے وزیر اعظم مصطفیٰ نحاس پاشا اور عرب اور مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو لکھا ہے۔اس خط کا عنوان ہے "روشنی کا پیغام"۔یہ خط اس وقت ہمارے سامنے ہے اور چھوٹے سائز کے ۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔اس خط میں انہوں نے بڑے ایجاز و بلاغت سے پہلے اسلام کے اصول و مبادی اور اسلامی تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالی ہے اور صاف صاف لکھا ہے کہ اس

قدر عظیم نظریہ حیات کی موجودگی میں مغربی طرز زندگی اور طرز تمدن و معاشرت کو اپنانا بہت بڑا خسارہ ہے۔ اس ابتدائی بحث کے بعد اسلامی نظریہ حیات اور مغربی نظریہ زندگی کا موازنہ کیا گیا ہے اور دونوں راستوں کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اسلام ہر پہلو سے خواہ عسکری تنظیم ہو یا صحت و تعلیم، اقتصادی اور معاشرتی اصلاحات ہوں یا ملکی قوانین، ملتِ اسلامیہ کی ترقی و خوشحالی کا ضامن ہے۔ آخر میں پچاس شقوں پر مشتمل اصلاحی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے دس سیاسی، عدالتی اور ملکی نظم و نسق سے متعلق ہیں۔ تیس معاشرتی اور تعلیمی امور سے متعلق، اور دس اقتصادی مسائل سے متعلق۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تجاویز کی تیاری میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں مرتب کرنے والے محض نظری اور کتابی علماء نہیں ہیں، بلکہ وہ ماہرین ہیں جو ملک کے مسائل سے براہِ راست عملاً رابطہ رکھتے ہیں۔ یہ تجاویز اگرچہ آج سے ۳۰ برس پہلے مرتب کی گئی ہیں مگر آج ۳۰ برس گزر جانے کے بعد بھی تازہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس خط کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوتا ہے: "ہم اپنی تمام تر خدمات اور صلاحیتیں اور وسائل ہر اُس حکومت کے تصرف میں دینے کے لیے تیار ہیں جو امتِ اسلامیہ کو ترقی اور فلاح سے ہمکنار کرنے کا عزم کرے۔ ہم اس کی ہر پکار پر لبیک کہیں گے اور ہر قربانی دینے کے لیے مستعد رہیں گے"۔

۱۹۳۸ء میں شاہ مصر کو ایک خط لکھا اور سیاسی پارٹیوں نے ملک کے اندر جو افراتفری برپا کر رکھی تھی اس کی شکایت کی۔ امیر عمر طوسن اور امیر محمد علی توفیق کو بھی اسی موضوع کا خط لکھا۔ اخوان کا خیال یہ تھا کہ اس وقت جتنی سیاسی پارٹیاں ہیں وہ خود ساختہ ہیں۔ عوام کی نمائندہ نہیں ہیں اور اب وقت آ گیا ہے کہ تمام محبِ وطن عناصر صحیح اسلامی نصب العین پر متحد ہوں اور اُسے پوری طاقت اور محنت سے بروئے کار لائیں۔ ۱۹۳۸ء میں وزیر قانون احمد خشبہ پاشا کو ایک طویل یادداشت پیش کی جس میں وزیر قانون سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ "پچاس سال تک غیر اسلامی قوانین کو آزمایا گیا ہے اور وہ سخت ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ اب اسلامی شریعت کا تجربہ کیا جانا چاہیے"۔ اس خط میں اسلامی قوانین کی صلاحیت و برتری پر خود اہلِ مغرب کی شہادتیں بھی پیش کی گئیں۔

جب مصطفیٰ نحاس پاشا ۱۹۳۸ء میں وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر بیٹھے تو اخوان نے انہیں بھی ایک یادداشت پیش کی اور اُن سے مطالبہ کیا کہ مصر کی خارجہ پالیسی اسلامی ممالک سے دوستی کے اصولوں پر استوار ہونی چاہیے اور اس کے پیشِ نظر اتحادِ اسلامی کا قیام ہو۔ ۱۹۳۹ء میں نحاس پاشا کو ایک اور خط لکھا گیا اور مشورہ دیا گیا کہ وفد پارٹی ۔۔ جس کے سربراہ نحاس پاشا تھے ۔۔ کے ممبروں کی زندگی اسلام کا صحیح نمونہ ہونی چاہیے اور وفد پارٹی اپنا منشور اسلامی اصولوں کی روشنی میں وضع کرے ۔ اس منشور میں مقننہ کے نظام میں اصلاح اور شہری اور شرعی عدالتوں کی تفریق کا خاتمہ اور تمام عدالتوں میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا پروگرام ہو ۔ نیز تعلیمی نظام میں اصلاح اور شہری اور شرعی عدالتوں کی تفریق کا خاتمہ اور تمام عدالتوں میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا پروگرام ہو ۔ نیز تعلیمی نظام میں اصلاحات کی جائیں، ہر صحت مند شہری کو فوجی ٹریننگ دی جائے، منکرات کا سدباب کیا جائے، اقتصادی پالیسی کو تبدیل کیا جائے، تقلیدِ یورپ کے رجحانات کو روکا جائے، سرکاری نظم و نسق کا بگاڑ درست کیا جائے ۔ ان تمام رسائل کا مرکزی موضوع یہ تھا کہ مصر کے اندر اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم کی جائے ۔ عرب ممالک میں ان رسائل کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ شمالی افریقہ، سوڈان، شام، فلسطین اور اُردن میں ان رسائل کی صدائے بازگشت سنی گئی ۔ ان رسائل نے اسلامی عناصر کے احساسات بیدار کرنے میں بڑی مدد دی ہے ۔

اخوان نے صرف خطوط لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ مصری حکمرانوں کو نصیحت و تفہیم کے جو بہتر سے بہتر ذرائع ہو سکتے تھے استعمال کیے ۔ ۱۹۳۶ء میں حسن البنا نحاس پاشا سے ملے ۔ اس وقت نسیم پاشا وزیراعظم تھے ۔ اخوان نے نسیم پاشا کی حکومت سے مصری مدارس کے اندر دینی تعلیم کو رائج کرنے کا مطالبہ کر رکھا تھا حسن البنا نے نحاس پاشا کو بھی مطالبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور ملک کے نامور سیاست دان ہونے کی حیثیت سے اس مطالبہ کے لیے ان کی تائید بھی حاصل کی ۔ نحاس پاشا حسن البنا سے اس قدر متاثر تھے کہ خود حسن البنا کے بقول " وہ انہیں یعنی

حسن البنا کو ۔۔۔ وفد پارٹی کا ایک رہنما سمجھا کرتے تھے ۔"

غیر اسلامی حکومتوں کے بارے میں اخوان کا موقف | حکومت کو راہِ راست پر لانے کے لیے اخوان نے جو کوششیں کیں اُن کے سلسلے میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس عرصہ میں مصر میں یکے بعد دیگرے جتنی حکومتیں قائم ہوئیں خواہ وہ دستور پارٹی کی تھیں یا وفد پارٹی کی یا آزاد، اخوان نے اُن کی تائید نہیں کی بلکہ ہمیشہ ان سے الگ رہے ۔ اخوان کا اس سلسلہ میں یہ اصول تھا کہ " جو حکومت سراسر غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہو اُس سے کسی بھلائی کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ وہ کسی تائید اور حمایت کی مستحق نہیں ہے ۔" لیکن چونکہ حکمران مسلمان تھے اور اسلام کا انہوں نے کھلا کھلا انکار نہیں کیا تھا، اس لیے اخوان نے ہر حکومت سے اصلاحات کا مطالبہ کیا اور ملک کے اندر مکمل اسلامی نظام رائج کرنے کی اپیل ان سے کرتے رہے ۔ اس کے ساتھ وہ قانون کے پابند رہے ۔ انہوں نے کبھی تشدد اور قوت کا راستہ اختیار نہیں کیا ۔ بلکہ اگر کسی وقت حکومت نے اُن کے مطالبے کو صدق دل سے قبول کرنے کا اظہار کیا تو انہوں نے اُس کی تائید میں بخل سے بھی کام نہیں لیا ۔ (باقی)

رسائل و مسائل

ایک حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب

(از ملک غلام علی صاحب)

سوال - بخاری شریف کا مطالعہ کرتے ہوئے کتاب الطلاق میں ایک حدیث اپنی کم علمی کی وجہ سے سمجھ نہ سکا اس لیے دلی تسلی کے لیے آپ سے رجوع ضروری سمجھا۔ امید ہے اپنی مصروفیت کے باوجود جواب سے مستفید فرمائیں گے۔ حدیث کتاب الطلاق میں ہے۔ باب کا عنوان ہے "جو شخص کسی سبب سے طلاق دے تو جائز ہے۔ اور کیا مرد کو طلاق دیتے وقت عورت کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے"۔ حدیث کا نمبر ۲۰۰ ہے جو نور محمد اصح المطابع کراچی کی مترجمہ صحیح بخاری سے لیا گیا ہے۔ حدیث کے راوی ابواسیدؓ ہیں۔ اس حدیث نبوی میں نبی اکرم صلعم جونیہ نامی عورت سے اکیلے باغ میں ملے جہاں جونیہ نے نبی اکرم صلعم پر بہت برے الفاظ استعمال کیے اور اس سے قبل نبی اکرمؐ نے اس سے فرمایا ھبی لی نفسکِ۔

براہِ کرم اس حدیثِ پاک کے متعلق مندرجۂ ذیل سوالات جو میرے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں ان کی تشریح اچھی طرح سمجھا کر دیں۔

۱- نبی اکرمؐ جونیہ کے پاس باغ میں کس مقصد کے لیے تشریف لے گئے تھے اور کیوں؟

۲- پہلے آپؐ دو صحابہ کے ساتھ تھے بعد ازاں عورت کے پاس اکیلے گئے۔ آخر کیوں؟

۳- حضور اکرمؐ نے عورت سے کہا تو مجھے اپنا نفس دے دے تو اس بات کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے؟

۴- جونیہ نے کہا کہ کیا "ملکہ بھی بازاری لوگوں کو اپنا نفس ہبہ کر سکتی ہے ؟" (یعنی نہیں کر سکتی) ۔ آخر یہ کلام اس نے کیوں کیا ؟

۵- کیا نبی اکرمؐ سے اس نے اس طرح انہی الفاظ سے خطاب کیا ؟ نبی اکرمؐ سے اس طرح بولنا تو انتہائی نازیبا حرکت ہے ۔ اس قسم کی حدیث کو بخاری صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے ۔ کیا یہ حدیث نبی اکرمؐ کی شان میں ایک گستاخی نہیں ؟

۶- اگر جونیہ آپؐ کی منکوحہ ہوتی تو آپؐ اکیلے باغ میں نہ جاتے، وہ آپ سے ان الفاظ سے خطاب نہ کرتی ، اور آپ اس کی تسلّی اور تسکین کی خاطر اس پر ہاتھ نہ رکھتے ۔ آخر اس حدیث کی کیا تشریح ہے ؟

۷- خدا سے پناہ مانگنے پر نبی اکرمؐ نے جونیہ کو پناہ دے دی اور امان دے دی ۔ آخر اس کا کیا مقصد ہے ؟

۸- حدیث پاک کے آخر میں ہے کہ آپؐ نے اسے (جونیہ کو) سامان دے کر اور دو سفید کپڑے دے کر روانہ کر دیا اس سے کیا مطلب ؟

۹- حدیث پاک کی تشریح کرتے ہوئے صاحب ترجم نے لکھا ہے کہ جونیہ حضور اکرمؐ کی منکوحہ تھی، لیکن اس کے ولی نے نکاح کیا تھا ۔ جونیہ کو نکاح کا علم نہیں تھا کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے ؟ اس پر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر جونیہ منکوحہ ہوتی تو آپؐ اسے اپنے حرم میں ہی لے آتے ۔ باغ میں جانے کا کیا مقصد ؟ اور اس سے اپنا نفس کیوں مانگتے ؟ اس کے علاوہ تشریح فرما دیں کہ حضورؐ کا نکاح جونیہ کے ساتھ کس موقع پر ہوا ؟ کون کون لوگ موقع کے گواہ تھے ؟

آخری بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اپنی کتاب میں کیوں جمع کیا ؟ اس سے امت کو کیا فائدہ پہنچانا تھا ؟

میں امید رکھتا ہوں کہ اس حدیث پاک کے ہر پہلو پر تشفی فرما دیں گے تاکہ وہ حضرات

جو اس حدیث سے نکتے نکالتے ہیں ان کو مسکت جواب دے سکوں۔

جواب - بخاری کی جس حدیث کا حوالہ آپ نے اپنے خط میں دیا ہے، اس میں کوئی بات قابلِ تعجب یا باعثِ اعتراض نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ جس عورت کا ذکر اس حدیث میں ہے، اس نے اور اس کے والد نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے والد کی خواہش پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے نکاح کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس عورت نے اپنے والد کی خواہش کا پاس کرتے ہوئے نکاح تو قبول کر لیا لیکن وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس جب خلوت میں گئے تو اس بدنصیب عورت نے ایسا طرزِ عمل اور طرزِ تکلّم اختیار کیا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ وہ آپ کی قیدِ نکاح میں رہنا نہیں چاہتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو جب حقیقتِ حال کا اندازہ ہو گیا تو آپ نے اسے بلا تاخیر نکاح سے خارج کر کے اور کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔ بس یہ مختصراً اس واقعہ کی حقیقت ہے جس پر آپ نے سوالات کی یہ طویل فہرست مرتب کر کے بھیجی ہے۔

آپ نے بخاری کا جو ترجمہ پڑھا ہے، اگر اس کے حاشیے میں یہ لکھا ہے کہ جَونِیّہ کا نکاح اس کے والد نے اس کے علم و اذن کے بغیر کیا تھا تو یہ بات غلط ہے، کیونکہ بالغہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ صحیح صورتِ حال وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ آنحضورؐ اس عورت کے پاس نکاح سے پہلے تشریف لے گئے۔ آپ نے جس حدیث پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر لی ہے اگر اس سے پہلے اور بعد کی احادیث بھی آپ پڑھ لیتے تو غالباً اتنے سوالات آپ کے ذہن میں پیدا نہ ہوتے۔ پہلے کی حدیث میں یہ ذکر ہے کہ "ازواج النبیؐ میں سے ایک (یعنی جَون کی لڑکی) کے پاس جب آنحضورؐ گئے تو اس نے اللہ کی پناہ مانگی"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ اس کے ازواج میں شامل ہونے کے بعد پیش آیا۔ پھر آپ کی نقل کردہ حدیث کے بعد والی حدیث میں بھی یہ تصریح ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُمَیمہ بنت شَراحِیل سے نکاح کیا، پھر جب اس سے خلوت ہوئی . . ."۔ اُمَیمہ دراصل اسی عورت کا نام ہے جسے دوسری احادیث میں جَونِیہ یا ابنۃ الجون

(جون کی لڑکی) وغیرہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ بنو جَون اُس قبیلے کا نام ہے جس سے یہ عورت تعلق رکھتی تھی۔

اس تشریح سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تنہا جس گھر یا باغ میں جانے کا ذکر ہے، وہ گھر اسی عورت کی جائے قیام تھا جس کا عقد آنحضورؐ سے ہو چکا تھا۔ اس کے بعد آپ کے یہ سارے سوالات غیر ضروری ہو جاتے ہیں کہ یہ باغ کیسا تھا۔ وہاں آنحضورؐ کے اکیلے جانے اور اس عورت سے ایسی بات کرنے کا کیا مقصد تھا؟ ایک خاوند اپنی بیوی کے پاس جا سکتا ہے اور اس سے ہر طرح کی بات کر سکتا ہے۔

باقی رہا آپ کا یہ سوال کہ عورت نے جواب میں یہ کیوں کہا کہ "ایک ملکہ بازاری لوگوں کے سپرد اپنے آپ کو کیسے کر سکتی ہے"۔ تو اس کا سیدھا صاف جواب یہ ہے کہ جو بدبخت انسان ایک نبی کی حقیقی قدر و منزلت سے ناآشنا ہو وہ اگر نبی کو کاہن، کاذب، مجنون، ساحر، شاعر سب کچھ کہہ سکتا ہے تو آخر "بازاری" ہی کیوں نہیں کہہ سکتا۔ منافقین اپنے آپ کو "معزّزین" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین مخلصین کو ذلیل کہتے تھے۔ اس طرح کی بکواس کوئی اچنبھے کی بات نہیں اور نہ اس سے نبی کی شان میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس عورت نے جو لفظ استعمال کیا تھا وہ "سُوقہ" تھا۔ اس کا ترجمہ بازاری کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ بازاری کے لفظ میں جو ابتذال پایا جاتا ہے، سُوقہ کے لفظ میں وہ نہیں پایا جاتا۔ عربی میں سُوقہ سے مراد "عامی" ہے جسے انگریزی میں (COMMONER) کہتے ہیں۔

آخری سوال آپ کا یہ ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث کو کیوں بیان کیا اور اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نبی کی ذات ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام اور بعد کے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ آپ کے ہر قول و فعل سے ہدایت اخذ کریں اور اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ آپ نے اس معاملے میں اتنے ایثار سے کام لیا کہ اپنی خانگی زندگی کے تعلقات اور زن و شو کے معاملات کو بھی مخفی نہیں رکھا اور صحابہ کے سامنے پیش

کر دیا۔ اور انہوں نے بھی ہر چیز کو بلا تامل، بلا خوف لومۃ لائم اسے آگے ہم تک پہنچا دیا۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام اس بات کے خواہش مند ہوتے کہ آپ کی ایک مصنوعی اور ادھوری تصویر دوسروں کے سامنے آئے تو شاید اس طرح کی پرائیویٹ چیزیں منظر عام پر نہ آتیں لیکن یہ تو ان حضرات اور پھر تابعین و محدثین کی دیانت و امانت کا کمال ہے کہ انہوں نے ہر شے کو بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے اور جو کچھ بیان ہوا ہے اس میں کوئی چیز بھی نبی کی شان کو گھٹانے والی نہیں ہے۔

آخر معترض یہ نہیں سوچتے کہ جس عورت کا نکاح اس کی اور اس کے ولی کی رضا سے منعقد ہو چکا ہو اور بعد میں وہ اسے ناپسند کرے اور شوہر کے منہ پر کہے کہ میں تمہیں اپنے سے کم تر درجے کا آدمی سمجھتی ہوں تو عام حالات میں ایک شوہر اس کا دماغ درست کرنے کے لیے اسے وظیفۂ زوجیت ادا کرنے پر مجبور کرے گا، زدوکوب کرے گا، یا اسے لٹکتا چھوڑ کر سبق دینے کی کوشش کرے گا تاکہ رانی مہارانی ہونے کا سودا اس کے سر سے اچھی طرح نکل جائے۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار نہ فرمایا۔ آپؐ اس عورت کے خاوند ہی نہیں تھے بلکہ مدینے کی اسلامی ریاست کے فرمانروا بھی تھے۔ اس کے باوجود آپؐ نے اس عورت پر کوئی جبر اور کوئی زیادتی نہیں کی۔ بلکہ جب اس نے اپنی شقاوت و حماقت کی بنا پر حرمِ نبوی میں رہنا گوارا نہ کیا تو آپ نے فوراً اسے کنایہ کے الفاظ میں طلاق دے دی اور کچھ سروسامان کے ساتھ رخصت کر دیا۔ یہ ضبط و تحمل اور فیاضی تو ایک نبی ہی کو زیب دیتی ہے۔ تعجب ہے ان لوگوں پر جو اس پر اعتراض چھانٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پردے پر ایک خاتون کے اعتراضات اور ان کا جواب

(از ابوالاعلیٰ مودودی)

سوال: میں آپ کی کتاب رسالۂ دینیات کا انگریزی ترجمہ پڑھ رہی تھی۔ صفحہ ۱۸۲ تک

مجھے آپ کی تمام باتوں سے اتفاق تھا۔ اس صفحہ پر پہنچ کر میں نے آپ کی یہ عبارت دیکھی کہ "اگر عورتیں ضرورتاً گھر سے باہر نکلیں تو سادہ کپڑے پہن کر اور جسم کو اچھی طرح ڈھانک کر نکلیں، چہرہ اور ہاتھ اگر کھولنے کی شدید ضرورت نہ ہو تو ان کو بھی چھپائیں"۔ اور اس کے بعد دوسرے ہی صفحہ پر یہ عبارت میری نظر سے گزری کہ "کوئی عورت چہرے اور ہاتھ کے سوا اپنے جسم کا کوئی حصہ (باستثنائے شوہر) کسی کے سامنے نہ کھولے خواہ وہ اس کا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو"۔ مجھے اول تو آپ کی ان دونوں عبارتوں میں تضاد نظر آتا ہے۔ دوسرے آپ کا پہلا بیان میرے نزدیک قرآن کی سورۂ نور آیت ۲۴ کے خلاف ہے اور اس حدیث سے بھی مطابقت نہیں رکھتا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت اسماءؓ سے فرمایا تھا کہ لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اُس کے جسم کا کوئی حصہ ہاتھ اور منہ کے سوا نظر نہ آنا چاہیے۔

کتاب کے آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ "شریعت کے قوانین کسی مخصوص قوم اور مخصوص زمانے کے رسم و رواج پر مبنی نہیں ہیں اور نہ کسی مخصوص قوم اور مخصوص زمانے کے لوگوں کے لیے ہیں"۔ مگر قرآن کو دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ پردہ محض ایک رواجی چیز ہے اور اسے اسلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا آپ یہ مانیں گے کہ آپ نے اسلامی قانون کی غلط تعبیر کر کے بہت سے لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا سامان کیا ہے؟ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا اسلام اس طرح پیش کیا جائے جس سے اِس زمانے کے نوجوان اس کو قبول کرنے سے بھاگیں۔ اسلام کی عائد کردہ قیود سے بڑھ کر اپنی طرف سے کچھ قیود عائد کرنے کا کسی کو کیا حق ہے؟

(یہ ایک مسلمان خاتون کے انگریزی خط کا ترجمہ ہے جو امریکہ سے آیا تھا)

جواب: میں آپ کی صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ آپ نے پوری طرح میری بات کو نہیں سمجھا۔ صفحہ ۱۸۲ اور ۱۸۳ پر جو کچھ میں نے کہا ہے اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ عورت کے لیے شریعت کے احکام تین اجزاء پر مشتمل ہیں:

چہرے اور ہاتھ کے سوا جسم کے دوسرے حصوں کو شوہر کے سوا کسی کے سامنے عورت کو نہ کھولنا چاہیے، کیونکہ وہ "ستر" ہیں اور ستر صرف شوہر ہی کے سامنے کھولنا چاہیے۔

چہرہ اور ہاتھ ان تمام رشتہ داروں کے سامنے کھولے جاسکتے ہیں، اور عورت اپنی زینت کے ساتھ اُن تمام رشتہ داروں کے سامنے آسکتی ہے جن کا ذکر سورۃ نمبر ۲۴، آیت نمبر ۳۱ میں کیا گیا ہے۔

ان رشتہ داروں کے سوا عام اجنبی مردوں کے سامنے عورت کو اپنی زینت بھی چھپانی چاہیے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں بیان کیا گیا ہے، اور اپنے چہرے کو بھی چھپانا چاہیے جیسا کہ سورۃ نمبر ۳۳ آیات ۵۳ تا ۵۵ اور آیت ۵۹ میں بیان کیا گیا ہے۔

انگریزی مترجمین ان آیات کا ترجمہ کرنے میں بالعموم گھپلا کر دیتے ہیں، لیکن اگر آپ عربی جانتی ہیں تو آپ کو خود یہ آیات اصل عربی میں دیکھنی چاہییں۔ ان کو پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید، شوہر، رشتہ داروں اور اجنبی مردوں کے بارے میں عورتوں کے لیے الگ الگ حدود مقرر کرتا ہے، اور اجنبی مردوں سے ان کو پورا پردہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔

آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پردہ محض لوگوں کی "رسم" پر مبنی ہے۔ قرآن کے آنے سے پہلے اہلِ عرب حجاب (پردے) کے تصور سے قطعی ناآشنا تھے۔ یہ قاعدہ سب سے پہلے قرآن ہی نے ان کے لیے مقرر کیا۔ اور بعد میں صرف مسلمانوں ہی کے اندر پردے کا رواج رہا۔ دنیا کی کوئی دوسری قوم اس کی پابند نہ تھی، نہ ہے۔ آخر آپ کے نزدیک وہ کس کی "رسم" ہے جو پردے کی صورت میں مسلمانوں کے اندر رائج ہوئی؟

آپ کا یہ خیال ٹھیک ہے کہ بے جا قیود کسی کو اپنی طرف سے بڑھانے کا حق نہیں ہے۔ مگر جو قیود قرآن اور حدیث سے ثابت ہیں، کسی مسلمان کو ماڈرنزم میں مبتلا ہو کر انہیں توڑنے کی فکر بھی نہ کرنی چاہیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اردو جانتی ہیں یا نہیں۔ اگر اردو کتابیں پڑھ سکتی ہوں تو میری کتاب پردہ، تفسیر سورۂ نور اور تفسیر سورۂ احزاب مطالعہ فرمائیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ پردے کے احکام قرآن کی کن آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کن احادیث پر مبنی ہیں، اور آپ یہ بھی جان لیں گی

کہ یہ قیود آیا بعد کے لوگوں نے بڑھا دی ہیں یا اللہ اور اس کے رسولؐ ہی نے ان کو عائد کیا ہے۔

غیر اسلامی دیار میں تبلیغِ اسلام

سوال: "کچھ عرصہ سے امریکہ میں آکر مقیم ہوں۔ یہاں کے لوگوں سے دینی و اجتماعی موضوعات پر تبادلہ خیالات کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اللہ نے جتنی کچھ سمجھ بوجھ دی ہے اور آپ کی تصانیف اور دوسرے مذہبی لٹریچر سے دین کا جتنا کچھ فہم و شعور پیدا ہوا ہے، اس کے مطابق اسلام کی ترجمانی کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ بظاہر مادی آسائشوں پر مطمئن ہیں اور انہی سے مزید اطمینانات حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ ان لوگوں کے مسائل اور دلچسپی کے موضوع ہمارے موضوعات سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کی گمراہیوں کی نوعیت و کیفیت بھی اپنے ہاں کی گمراہیوں سے الگ اور شدید تر ہے۔ جس طرزِ استدلال سے ہم مسلمان معاشرے کے بھٹکے ہوئے افراد کو راہِ راست کی طرف بلا سکتے ہیں اور انہیں اسلام کے اصولوں کا قائل بنا سکتے ہیں، وہ طرزِ استدلال یہاں شاید کارگر نہ ہو۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں کے ماحول اور ذہنیت کو سامنے رکھ کر تبلیغ و تلقین کا اصول اور طریقِ کار واضح کریں اور مجھے سمجھائیں کہ یہاں لوگوں کو ان کے فکر و عمل کی گمراہی اور ضرر رسانی کا احساس کس طرح دلایا جا سکتا ہے اور انہیں آمادۂ اصلاح کرنے کی کیا تدابیر ہو سکتی ہیں۔ یہاں کسی بڑی تعداد کو اسلام کی جانب مائل کرنا اور دائرۂ اسلام میں داخل کرنا تو مشکل نظر آتا ہے۔ بس یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آغازِ کار میں کیا طریقہ کار اختیار کرنا مناسب ہو گا۔"

جواب: امریکہ میں آپ کو جس مسئلے سے سابقہ درپیش ہے وہ درحقیقت نیا نہیں ہے بلکہ

اس طرح کی مادہ پرست سوسائٹی جہاں بھی پائی گئی ہے وہاں قریب قریب ایسی ہی دشواریوں سے دعوتِ حق کو سابقہ پیش آیا ہے۔ تفہیم القرآن میں مکی سورتوں کو آپ غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قریش کی ذہنیت بھی ایسی ہی تھی۔ اس ذہنیت کے لوگوں کو جھنجھوڑنے اور ان کو حقائق کی طرف توجہ دلانے کے لیے قرآن مجید میں جو طرزِ دعوت اختیار کیا گیا ہے اس کو آپ اچھی طرح غور سے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کریں تو ہر ایسی سوسائٹی میں دعوت کا ڈھنگ آپ کو آجائے گا۔ اس ڈھنگ پر دعوت دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس معاشرے میں آپ کام کر رہے ہیں اس کی بنیادی خرابیوں کے متعلق آپ کے پاس مفصل معلومات ہوں۔ اور ان خرابیوں سے جو نتائج برآمد ہو رہے ہیں ان کے متعلق بھی آپ زیادہ سے زیادہ صحیح، مستند اور مفصل معلومات حاصل کریں۔ امریکہ کے بارے میں ایسی معلومات آپ کو بڑی آسانی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ جرائم کی روز افزوں ترقی، جرائم کے سائنٹفک اور منظم طریقے اور ان کی پشت پر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہانت کا کارفرما ہونا، ۲۰ سال سے کم عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں میں ایک طرف جرائم اور دوسری طرف غیر معمولی اور غیر معتدل شہوانیت (ABNORMAL SEXUALITY) کا روز افزوں ہونا، طلاق کی کثرت اور خانگی زندگی کا نظام درہم برہم ہونا، ایک طرف انتہائی دولت اور دوسری طرف انتہائی غربت کا پایا جانا اور اپنے ہی معاشرے کے افراد نہیں بلکہ اپنے رشتہ داروں اور خود اپنے بوڑھے ماں باپ تک سے لوگوں کا بے اعتنائی برتنا، اور اس کے ساتھ بین الاقوامی دنیا میں وہ سفّاکی جو ویٹ نام میں برتی جا رہی ہے اور وہ خود غرضانہ ظلم جو فلسطین میں اسرائیل کو زبردستی قائم کر کے کیا گیا، یہ وہ چیزیں ہیں جن کی طرف توجہ دلا کر آپ امریکی سوسائٹی کے ایسے افراد کو اپنی مادہ پرستانہ تہذیب کے بنیادی نقائص کا احساس دلا سکتے ہیں جن کے ضمیر میں ابھی تک کچھ زندگی باقی ہو۔ اس طرح کے مواد سے کام لے کر تنقید بھی اسی انداز میں کیجیے جو قرآن میں اختیار کیا گیا ہے اور بنیادی اصلاح کی طرف دعوت بھی قرآنی انداز میں اور قرآنی استدلال کے طرز پر دیجیے۔

امریکہ والوں کی دوسری گمراہی عیسائیت ہے اور اس پر تنقید کرنے کے لیے آپ کو پورا مواد تفہیم القرآن کے ذریعہ سے مل سکتا ہے ۔ چاروں جلدوں کے انڈکس بغور دیکھ کر آپ مواد جمع کر سکتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ آپ کو عیسائیت کا کم از کم ضروری مطالعہ کرنا ہوگا تاکہ آپ ناواقف کی طرح نہیں بلکہ ایک واقف کار آدمی کی طرح بول سکیں ۔ مزید براں آپ یہ بات بھی لوگوں کے ذہن نشین کیجیے کہ خدا کی طرف سے جو اصل دین نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے ابتدا سے تمام انبیاء لاتے رہے ہیں وہ کیا تھا ۔ اور بعد میں عیسائیت ، یہودیت ، اور دوسرے مذاہب اُسی حقیقی دین کو بگاڑ کر کیسے بنا دیئے گئے ہیں ۔ اس کے متعلق آپ کو مفصل معلومات تفہیم القرآن کے ذریعہ سے مل جائیں گی ۔ انڈکس میں " نبوت " کا عنوان نکال کر دیکھ لیں ۔ اس طریقہ سے آپ لوگوں کو یہ سمجھا سکیں گے کہ ہم دراصل آپ کا مذہب تبدیل کرنے کے بجائے آپ کو اُس دین کی طرف بلا رہے ہیں جو خود حضرت عیسیٰ اور موسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کا دین تھا ۔ ان کو بتائیے کہ اسلام صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا دین نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء اور تمام کتبِ آسمانی کا دین ہے اور ایک مسلمان ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کرتا بلکہ سب کو مانتا ہے ۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھیے کہ اس طرح کی سوسائٹی میں وسیع پیمانے پر تبدیلی مذہب (CONVERSION) نہیں ہوا کرتی ۔ داعی کو اگرچہ سینکڑوں آدمیوں تک پہنچنا ہوتا ہے ، مگر ابتداً مشکل سے ایک دو آدمی حق کو قبول کرتے ہیں ۔ آپ جن لوگوں سے بھی بات کریں ان میں کسی ایک ایسے آدمی کو تلاش کیجیے جس میں قبولِ حق کی صلاحیت ہو اور جو حق و باطل کے معاملہ میں سنجیدہ فکر و نظر کا حامل ہو ۔ ایسا آدمی جب مل جائے تو پہلے اسی پر زیادہ محنت صرف کیجیے یہاں تک کہ وہ آپ کا پورا مددگار بن جائے ۔ پھر وہی مزید آدمیوں کی اصلاح کا ذریعہ بن سکے گا ۔ مگر کسی ایسے شخص کے قبولِ اسلام پر اعتماد نہ کیجیے جس کے جذبات ، افکار ، طرزِ فکر اور طرزِ زندگی میں بنیادی تبدیلی رونما نہ ہو ۔ اسلام کے کسی ایک پہلو کو دیکھ کر جو اہلِ مغرب مسلمان ہو جاتے ہیں ، مگر مسلمان ہو کر بھی وہی کچھ رہتے ہیں جو قبولِ اسلام سے پہلے وہ تھے ، وہ درحقیقت کسی کام کے لوگ نہیں ہیں بلکہ ان کا مسلمان ہونا بجائے خود ایک فتنہ ہے ۔

مطبُوعات

قادیانیت بزبان انگریزی | تالیف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ ترجمہ: جناب ظفر اسحاق انصاری صاحب ۔ شائع کردہ: مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ (بھارت)۔ قیمت ساڑھے پانچ روپے ۔ صفحات ۱۵۳ ۔

اس قابل قدر کتاب پر ترجمان القرآن میں پہلے تبصرہ شائع ہو چکا ہے ۔ یہ اس کا انگریزی ترجمہ ہے ۔ فاضل مترجم نے بڑی محنت اور کاوش سے اسے انگریزی میں منتقل کیا ہے ۔ اس کتاب کو مغربی ممالک میں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ جو لوگ اسلام سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں قادیانیت کی حقیقت معلوم ہو سکے اور وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اسے اسلام ہی کا ایک فرقہ نہ سمجھتے رہیں ۔ طباعت کا معیار گوارا ہے لیکن اگر یہ معیار اس سے بلند ہوتا تو اچھا تھا ۔ پاکستان میں یہ کتاب کہاں سے مل سکتی ہے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ۔

علم جدید کا چیلنج | تالیف ۔ جناب وحید الدین خاں صاحب ۔ رفیق مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام ۔ شائع کردہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ (بھارت)۔ قیمت ۵ روپے ۔ صفحات ۲۹۸ ۔

جاہلیت نہ تو ایک راہ سے آتی ہے اور نہ ایک انداز کی تاریکی پھیلاتی ہے ۔ اس کے آنے کے متعدد راستے ہیں اور اس کے تاریک سایے مختلف صورتوں میں پھیلتے ہیں ۔ اس بنا پر دین کے خادموں کے لیے یہ ضروری ہے کہ جاہلیت کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کا مزاج اور اس کے عناصرِ ترکیبی اور اس کے حملہ کرنے کے انداز اور طریقوں کو اچھی طرح سمجھیں علم الکلام

کے جن ہتھیاروں سے ہم نے یونان کے باطل افکار و نظریات کی جنگ بڑی کامیابی کے ساتھ لڑی تھی وہ اب بیکار ہو چکے ہیں۔ جدید جاہلیت نے نئے مسائل پیدا کیے ہیں اور یہ بالکل نئے انداز سے اور نئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر اسلام کے قلب پر حملہ آور ہوئی ہے۔ اس لیے اس کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے اسے اچھی طرح سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ فاضل مصنف نے مغرب کی جاہلی تہذیب کے چیلنج کی نوعیت کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یوں تو یہ فاضلانہ تصنیف ہر طبقے کے لیے مفید ہے لیکن علماء کو اس کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ اسلام پر کس سمت سے شدید حملہ ہو رہا ہے اور دشمنوں کا وار کس مقام پر پڑ رہا ہے۔

عقلیات ابن تیمیہؒ | تالیف: مولانا محمد حنیف صاحب ندوی۔ شائع کردہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۳۵۹۔ قیمت اخباری کاغذ ۶ روپے۔ سفید کاغذ ۹ روپے۔

علامہ ابنِ تیمیہؒ کی پوری زندگی چونکہ الحاد و زندقہ کے خلاف جہاد میں بسر ہوئی اس لیے یہ جتنی مختلف شکلیں اختیار کر سکتا تھا اُن سب پر علامہ نے نہایت مضبوط گرفت کی۔ اگر اس نے بدعات کی صورت اختیار کی تو علامہ مرحوم نے ان کی پُر زور تردید کی، اگر اس نے تصوّف کا جامہ پہن کر عوام کو فریب دینا چاہا تو علامہ نے یہ جامہ نوچ لیا، اگر یہ یونانیت اور عجمیت کے دبیز نقاب اوڑھ کر آیا تو علامہ نے انہیں ہٹا دیا۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں فاضل مصنّف نے علامہ مرحوم و مغفور کی "عقلیات" پر بڑی جامع اور فاضلانہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ علامہ نے کس دیدہ وری سے اپنے عہد کے باطل فلسفوں اور نظریات کا جائزہ لے کر ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور پھر دلائل سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ان افکار کے مقابلے میں اسلام کا عقلی موقف کس قدر صحیح، مضبوط اور متوازن ہے۔ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی کا اندازِ بیان علمی اور دلکش ہے اور انہوں نے اس کتاب کو اسی انداز سے مرتب کیا ہے جس طرح کہ کسی فلسفے کی

کتاب کو ترتیب دینا چاہیے۔ معیار طباعت و کتابت عمدہ ہے۔

نقش، کراچی جنگ نمبر | زیر ادارت جناب شاہد احمد دہلوی۔ جناب شمس زبیری صاحب شائع کردہ: کاشانۂ اردو، پوسٹ بکس ۷۳۰۲۔ کراچی نمبر ۳۔ قیمت چھ روپے۔ صفحات ۶۱۴

گزشتہ سال جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو اہل پاکستان کو فکر و نگاہ کے نئے زاویے اور عمل کے نئے میدان ہاتھ آئے اور پوری قوم جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر ہند و جارحیت کے خلاف سربکف ہو گئی۔ اس مختصر سی مدت میں پاکستان کے ادباء، شعراء اور اہلِ قلم نے بعض نہایت قیمتی تخلیقات پیش کیں جن میں ایک طرف اندھے بہرے استبداد کے خلاف جذبۂ نفرت و حقارت تھا اور دوسری طرف اہلِ پاکستان کو خدا پر بھروسہ کر کے ہمت و استقلال کے ساتھ دشمنوں پر غالب آنے کی تلقین تھی۔ زیرِ تبصرہ مجلّہ میں ان تخلیقات کا ایک نہایت اچھا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

ماہنامہ قومی زبان | زیر ادارت جناب مشفق خواجہ صاحب۔ شائع کردہ: انجمن ترقی اردو، پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی۔ صفحات ۲۳۵۔

مولوی عبدالحق صاحب نے نصف صدی تک جس دلجمعی، دل سوزی، یکسوئی کے ساتھ اُردو کی خدمت کی ہے اس کی مثال زبان و ادب کے میدان میں کیا، قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی بہت کم ملے گی۔ زیرِ تبصرہ مجلّہ میں مولوی صاحب کے عقیدت مندوں نے ان کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس بزم میں اردو زبان کے نامور ادباء اور شعراء شریک ہیں۔ معیار طباعت و کتابت نہایت عمدہ ہے۔

مخلوط تعلیم | تالیف: جناب احمد انس صاحب۔ شائع کردہ ادارہ مطبوعات جمعیت،

(باقی ص ۲ پر)

(بقیہ اشارات)

سوچے کہ اپنی قوم کے جذبات سے لڑنا فی الحقیقت کیسا مہنگا سودا ہے۔

انڈونیشیا پر مبدءِ فیض سے قدرتی وسائل کی صورت میں جو نوازشات ہوئی ہیں ان میں کم ہی کوئی دوسرا ملک اس کی ہمسری کر سکتا ہے۔ مگر یہ ملک اپنے ان بے مثال وسائل کے ہوتے ہوئے اس وقت معاشی حیثیت سے نہایت خستہ حال ہو رہا ہے۔ آپس کی خانہ جنگی نے اس کے لاکھوں فرزندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اندرونی کشمکش نے اس کے وقار اور اس کی طاقت کو شدید نقصان پہنچایا ہے، اور آزادی کے بعد قدرت کے ان عطیات سے فائدہ اٹھا کر ترقی کرنے کے بجائے استعمار کے زمانے کی بہ نسبت اس کی صنعت و تجارت اور خوشحالی کچھ کم ہی ہو گئی ہے۔ یہ سب کچھ اس کا نتیجہ ہے کہ ایک چھوٹے سے برسرِ اقتدار گروہ نے اپنی قوم کے مزاج، اس کی تاریخ اور اس کی روایات کو نظر انداز کر کے اسلام اور کمیونزم اور قوم پرستی کا ایک خود ساختہ ملغوبہ زبردستی اس پر ٹھونسنے کی کوشش کی، اور ملک جس چیز پر فطرتاً متحد ہو سکتا تھا اس کے بجائے ایک مصنوعی چیز پر جبراً اس کو متحد کرنا چاہا۔ اس کی بدولت اتحاد کی جگہ سخت افتراق برپا ہوا اور ایک محتاط اندازے کے مطابق آپس کی کشمکش میں کم از کم دس لاکھ انسان ہلاک ہو گئے۔ ان بیچاروں کو باہر کے کسی دشمن نے تو برباد نہیں کیا، ملک کے اندر ہی چند شراروں نے خرمنِ امن کو آگ لگا کر اسے بھسم کر دیا اور اس میں لاتعداد قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"۔ اگر کوئی شخص اس کی دردناک تصویر دیکھنا چاہتا ہے تو اسے صرف مسلمان ممالک کے موجودہ حالات پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ اُسے خود معلوم ہو جائے گا کہ گھر کے چراغوں سے جب متاع جلتی ہے وہ منظر کتنا کربناک اور اس کے اثرات

کتنے تباہ کن ہوتے ہیں۔ مغربی سامراج نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے اس امر کا انتظام کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو برباد کرنے کے لیے خود انہیں کوئی سامان نہ کرنا پڑے بلکہ ان کے اپنے چراغوں سے یہ کام لیا جائے اور وہ خود اس گھر کو پھونک دینے کا تماشا دنیا کو دکھائیں۔ یہ چراغ وہ ہیں جن سے ہم بجا طور پر روشنی کی توقع رکھتے تھے لیکن یہ مسلمانوں کی شبِ تاریک کو منور کرنے کی جگہ اُن کی متاعِ حیات کو ہی خاکستر کیے دے رہے ہیں۔

آپ خود غور کیجیے کہ قدرت کا کونسا ایسا عطیہ ہے جو مسلمانوں کے پاس نہیں۔ قدرتی وسائل کے اعتبار سے یہ دنیا کی قوموں میں ممیز اور ممتاز ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے یہ کسی دوسری قوم سے پیچھے نہیں۔ پھر ان کے درمیان ایک ایسا رشتۂ اخوت موجود ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ یہ اپنا ایک شاندار تابناک ماضی رکھتے ہیں۔ ان کی ملی روایات نے ان کے اندر یگانگت اور یک جہتی کے احساسات پیدا کر رکھے ہیں۔ یہ اپنے سامنے ایک ایسا اونچا اور مقدس نصب العین رکھتے ہیں جس کی مقناطیسی کشش نے انہیں ماضی اور حال ہر عہد میں سرگرمِ عمل کیا ہے۔ جب بھی انہوں نے اس پاکیزہ مقصد کے حصول کے لیے کوئی کوشش کی تو اس کے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہوئے۔ انتشار کی جگہ اتحاد و اتفاق نے لے لی۔ قوم کے مضمحل اعضاء میں آناً فاناً خونِ زندگی دوڑنے لگا۔ قوم کی خفتہ صلاحیتیں فوراً بیدار ہوئیں اور اس قوم نے اس مقصد کی خاطر ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جس پر پوری دُنیا حیران رہ گئی۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ اسلام نے پارس کی طرح اس مسِ خام کو کندن بنا کر رکھ دیا ہے۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ قوم اس انقلاب انگیز نصب العین کو کیوں نہیں اپناتی۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ لیکن اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی غلامی نے ہمارے اندر ایک ایسے طبقہ کو با اختیار بنا دیا ہے جو پولیس اور فوج کی مدد سے مسلم عوام کی رائے عامہ کو اُبھرنے نہیں دیتا اور وہ اُسے کسی ایسی قیادت سے محروم رکھ رہا ہے جو اس کی دلی تمناؤں اور آرزوؤں کی ترجمان ہو۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں کشمکش ہے مختلف

طبقوں کے درمیان منافرت اور کشیدگی ہے اور اسی بنا پر ہماری قومی صلاحیتیں تعمیر و ترقی کی راہ پر لگنے کے بجائے باہمی آویزش میں صرف ہو رہی ہیں۔ یہ قوم قدرت کی طرف سے بانجھ بنا کر نہیں بھیجی گئی بلکہ اس کی اس سرپھٹول نے اسے تخلیقی قوت سے محروم کر کے رکھ دیا ہے۔

(بقیہ مطبوعات)

۲۳ اسٹریچن روڈ کراچی۔ صفحات ۹۱۔ قیمت ایک روپیہ۔

ہمارے ہاں تعلیم کے میدان میں جو مختلف مسائل درپیش ہیں اُن میں ایک اہم مسئلہ مخلوط تعلیم کا ہے۔ اس مسئلہ کا تعلق مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ان کے اساسی تصورِ حیات اور اُن کے فلسفۂ اخلاق سے ہے۔ فاضل نوجوان جناب احمد انس صاحب نے اس کتابچے میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا نہایت اچھے علمی انداز میں جائزہ لیا ہے اور ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے اس کے مہلک اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

ادارۂ مطبوعاتِ جمعیت کی یہ ایک نہایت اچھی پیش کش ہے۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

اِسلام کا نظامِ حکمرانی کیا ہے؟

خلافت یا ملوکیت

◉ خلافتِ راشدہ کی بُنیادی خصوصیات۔ ◉ خلافت اور ملوکیت کا فرق۔
◉ اِسلامی تاریخ پر ملوکیت کے اثرات۔ ◉ صلحائے اُمت کے روشن کارنامے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

کی تازہ ترین تحقیقی تالیف

خلافت و ملوکیت

میں مطالعہ فرمایئے

اِسلامی تاریخ اور سیاسیات کے طلباء کیلئے ایک بیش قیمت کِتاب

اعلیٰ ایڈیشن ۸/۲۵ روپیے ـــــ سستا ایڈیشن ۴/۷۵ روپیے

۳۱ اکتوبر ۱۹۶۶ء تک

موصول ہونے والی فرمائشوں پر صرف

۶/۵۰ روپیے اعلیٰ ایڈیشن ـــــ ۳/۵۰ روپیے سستا ایڈیشن

علاوہ محصول ڈاک مہیا کی جائے گی ۔ آج ہی ایک خط لکھ کر اپنی جلد محفوظ کرا لیجیے

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ. شاہ عالم مارکٹ لاہور